اہل علم وارباب افتاء وقضاء کے لئے اہم ہدایات

افادات

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگا ہردوئی روڈ لکھنؤ

تفصیلات

نام کتاب.................. تحفۃ المفتی

افادات.......... فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

انتخاب وترتیب.................. محمد زید مظاہری ندوی

سن اشاعت...................... ۱۴۳۴ھ

صفحات...........................۸۰

قیمت.......................... ۷۰/روپے

ویب سایٹ.........www.alislahonline.com

ملنے کے پتے

☆ دیوبند وسہارنپور کے تمام کتب خانے

☆ افادات اشرفیہ دوبگا ہردوئی روڈ لکھنؤ

☆ مکتبہ ندویہ ، ندوۃ العلماء لکھنؤ

☆ مکتبہ رحمانیہ ہتورا، باندا، پن کوڈ: ۲۱۰۰۱

☆ مکتبۃ الفرقان نظیر آباد لکھنؤ

☆ مکتبہ اشرفیہ ۳۶، محمد علی روڈ بمبئی ۹

فہرست آداب افتاء واستفتاء

فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

عنوانات صفحہ

بابٓ۲ متفرق فوائد

بابٓ۳ آداب فتویٰ

فصل

باب ۴

فصل

باب ۵ آداب المستفتی

باب ۶

☆☆☆

☆

تقریظ

حضرت مولانا مفتی عبید اللہ صاحب الاسعدی مدظلہ

(استاذ حدیث وصدر مفتی جامعہ عربیہ ہتورا ضلع باندہ)

''دارالعلوم دیوبند'' ایک تعلیمی ادارے کا ہی نہیں، بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کا نام تھا، اور دارالعلوم کے جن فرزندوں نے اس تحریک کی کامیابی کا ثبوت دیا اور آئندہ اس کو رواں دواں رکھا، ان میں نمایاں نام رکھنے والوں میں ''(فقیہ النفس حضرت) مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ'' کا نام بھی روشن ہے، یوں تو دارالعلوم سے کسب فیض پھر حکیم الامت سے نسبت نے تمام ہی علوم دینیہ میں ان کو نمایاں مقام عطا کیا تھا، تفسیر میں ان کے تبحر کی روشن دلیل، ان کی شاہکار تفسیر ''معارف القرآن'' ہے جس نے بالخصوص ادھر چند سال کے عرصوں میں دینی مقبولیت کے ساتھ مفتی علیہ الرحمۃ کو کافی متعارف کرایا ہے، لیکن ان کا اصل فن وموضوع ''علم فقہ'' تھا فقہ سے ان کی مناسبت اور اس میں کمال وتفوق کی اس سے بڑھ کر شہادت کیا ہوگی کہ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی کے بعد ملک کے سب سے مؤقر دارالافتاء کی صدارت آپ کو تفویض ہوئی اور اس عہد میں جو کہ اکابر کا ہی عہد تھا اور حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ جیسے فقیہ وقت بھی مفتی صاحب کے فتاوی پر نہ صرف اعتماد کرتے تھے بلکہ اپنی ضروریات میں رجوع بھی کرتے تھے۔

ترکی کے شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری جو کہ خود ایک بلند پایہ حنفی عالم ومحقق تھے انہوں نے بھی مفتی صاحب کو ''فقیہ النفس'' کا خطاب دیا ہے۔

ہمارے جامعہ کے ایک نوعمر مدرس ومفتی برادرم مولوی زید صاحب کو اکابر کی

تحریرات کے مطالعہ کے بعد اس کی ترتیب وتبویب سے خاص شغف ہے، اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ سے متعلق ان کی تالیفات کا سلسلہ اب محتاج تعارف نہیں رہا، دوسرے حضرات سے متعلق بھی کام کیا ہے، اور خود ہمارے حضرت (مولانا سید صدیق احمد صاحب باندویؒ) سے متعلق بھی ماشاء اللہ بہت کچھ جمع کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں مولوی موصوف نے اپنے موضوع کی مناسبت سے مفتی صاحب کی ان تحقیقات کو جمع ومرتب فرمایا ہے جو فقہاء واہل افتاء کے لئے مشعل راہ ہیں، ان چیزوں کا یکجا ہونا ضرورت مندوں کے لئے استفادہ کو تو آسان بناتا ہی ہے، ان چیزوں سے یہ بات بھی روشن وعیاں ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اکابر سے کیا کیا کام لیا ہے اور ان حضرات کا ذوق ومزاج کیا تھا، گیرائی، نباضی، بصیرت ودقت نظر، احتیاط وتثبت کہ جس کے بعد حضرت تھانویؒ کے اس ملفوظ کو قبول نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ

''ہمارے اکابر کی کاوشوں کو اگر عربی میں منتقل کر دیا جائے اور نام نہ ظاہر کیا جائے تو لوگ ان کو علماء متقدمین ومتاخرین کی کاوش سمجھیں گے''۔

اللہ تعالیٰ مولوی موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی ان کاوشوں کو جو ہم طلبہ پر ایک عظیم علمی احسان ہے، شرف قبولیت سے نوازے۔

عبید اللہ الاسعدی غفرلہٗ

(استاد حدیث وصدر مفتی جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی))

عرض مرتب

مفسر قرآن، فقیہ النفس، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی شخصیت اور فقہ وفتاویٰ میں آپ کا مرتبہ ومقام محتاج تعارف نہیں، آپ کی شاہکار تفسیر ''معارف القرآن'' اور علمی وفقہی تحقیقات، جدید مسائل میں آپ کی کاوشیں آپ کے تبحر علمی اور فقاہتِ نفس کا بیّن ثبوت ہیں، آپ فطرۃً سلیم الطبع اور فقیہ النفس تھے، جس کی شہادت ہندوپاک کے علاوہ دوسرے ممالک کے کبار علماء نے بھی دی ہے۔

اسی فقاہتِ نفس کا نتیجہ تھا کہ آپ کی مایہ ناز تفسیر ''معارف القرآن'' میں دین اسلام اور اصول شرع سے متعلق جتنے مباحث قرآنی آیات کی روشنی میں سمجھے اور سمجھائے جاسکتے تھے اس کے کسی گوشے اور پہلو کو آپ نے چھوڑا نہیں، حالاتِ حاضرہ اور نئے نئے باطل فرقوں پر بھی آپ کی گہری نظر تھی، ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات قرآنیہ کی روشنی میں آپ نے اسلام کے ایسے مبادی جن کو اصول شرع واصول فقہ کہا جاسکتا ہے بیان فرمائے، جس سے دین اسلامی اور فقہ اسلامی کی بنیادیں مضبوط ومحفوظ ہوتی ہیں، اور مستشرقین ومتشککین کے شکوک وشبہات کا قلع قمع ہوتا ہے، ان اسلامی اصول کے عناوین یہ ہیں قرآن، حدیث، اجماع، قیاس، انبیاء، صحابہ، اجتہاد وتقلید، افتاء وقضاء، کفر واسلام، توحید وشرک، ایمان ونفاق، سنت وبدعت وغیرہ ان بنیادی واصولی مباحث کو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے قرآنی آیات کی روشنی میں نہایت تفصیل سے مختلف آیات کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے۔

احقر نے صرف ایسے ہی اصولی وبنیادی مباحث کو حضرت مفتی صاحبؒ کی معارف القرآن نیز بعض دیگر تصانیف وفتاویٰ سے چن چن کر مرتب کیا ہے، یہ کام اب سے تقریباً اٹھارہ بیس سال پہلے ہو چکا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی، البتہ اس کا

صرف ایک حصہ جو آداب افتاء واستفتاء سے متعلق تھا وہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے افادات پر مشتمل کتاب ''آداب افتاء واستفتاء'' کے ساتھ شائع ہو چکا تھا، اس کے متعلق بعض اکابر خصوصاً حضرت مولانا محمد یونس صاحب دامت برکاتہم (شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور) کی رائے یہ ہوئی کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے افادات علیحدہ مستقلاً شائع کئے جائیں چنانچہ آداب افتاء واستفتاء سے متعلق یہ مختصر رسالہ علیحدہ شائع کیا جارہا ہے۔ باقی اصولی مباحث ''اصول الفقہ والشرع'' کے نام سے شائع کئے جائیں گے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی پوری زندگی علوم اسلامیہ کی خدمت خصوصاً فقہی تحقیقات اور فتاویٰ نویسی میں گذری، اسی لئے اس سلسلہ کے جن مراحل سے آپ کو گذرنا پڑا اور جتنے تجربات آپ کو حاصل ہوئے کم لوگوں کو ہوئے ہوں گے، اہل علم وارباب افتاء کو ان تجربات سے فائدہ اٹھانا نہایت مفید بلکہ ضروری ہے، چنانچہ متعدد اہل علم واہل قلم نے خصوصاً آپ کے لائق وفائق، سعادت مند فرزند، داعی الی اللہ، مصلح کبیر، مترجمِ قرآن، شارحِ حدیث، فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہٗ نے اپنے والد ماجد حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی زندگی کے اس پہلو کو اپنے مقالات میں مختلف عنوان سے تحریر فرمایا ہے جو رسالہ ''البلاغ'' کے خصوصی شمارہ مفتی اعظم نمبر میں شائع ہو چکے ہیں، یہ مختصر رسالہ دراصل انہی اہل علم واہل قلم کے مضامین سے ماخوذ اور ان کے اقتباسات کا مجموعہ ہے جس کو احقر نے اپنے عناوین کے ساتھ مرتب کیا ہے، کچھ مضامین معارف القرآن سے بھی ماخوذ ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کو قبول فرمائے اور امت کے لئے نافع بنائے۔

محمد زید مظاہری ندوی
استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
یکم ربیع الاول ۱۴۳۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ۱

حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا فقہی مقام

کیا حضرت مفتی صاحب فقیہ النفس تھے؟

حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

"فقیہ النفس" فقہاء کی ایک اصطلاح ہے، اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرت ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا ہو۔

مجھ جیسے بے علم و عمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے کیوں کہ فقیہ النفس کی پہچان بھی انہی لوگوں کا حصہ ہے جنہیں اللہ تعالی نے تبحر علمی سے نوازا، چنانچہ اس پہچان کے لئے بھی حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے انسان کی ضرورت ہے جنہوں نے علامہ ابن عابدین شامی جیسے وسیع العلم انسان کو بھی "فقیہ النفس" تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ لفظ علامہ ابن نجیم جیسے حضرات پر راست آتا ہے، اور ساتھ ہی اپنے دور میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے بارے میں اعتراف کیا کہ وہ فقیہ النفس تھے۔

لہٰذا میری یہ مجال نہیں ہے کہ میں حضرت والد صاحب کے فقیہ النفس ہونے نہ ہونے پر کوئی تبصرہ کر سکوں البتہ مصر کے معروف اور محقق عالم شیخ الاسلام علامہ زاہد

الکوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحب کو فقیہ النفس کا خطاب دیا تھا۔

علامہ زاہد الکوثریؒ وہ بزرگ ہیں جن کو ان کے تبحر علمی اور وسعت معلومات کی بنا پر اگر مصر کے علامہ انور شاہ کشمیری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ حضرت والد صاحب نے ایک فقہی مسئلے کی تحقیق میں ان کو خط لکھا تھا، اس خط کا جو جواب آیا، یہاں میں وہ نقل کرتا ہوں [1]

علامہ زاہد الکوثری کا مکتوب

إلى حضرة اخينا فى الله العلامة المحدث الفقيه المفتى محمد شفيع الديوبندى حفظه الله ورعاه وعليكم السلام ورحمة الله وبركاته.......... امابعد:

ومن مدة بعيدة كنت متشوقا إلى ذاتكم الكريمة حيث كنت رأيت بعض آثاركم الممتعه وانتفعت بها، وأماالاستفتاء فانت ابن بجدة الفتوى وقد طالت مما رستكم حتى أصبحت فقيه النفس بالمعنى الصحيح.

ترجمه: مکتوب کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

اخی فی اللہ علامہ محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی حفظہ اللہ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں مدت دراز سے آپ کی مبارک ذات سے متعارف ہونے کا مشتاق تھا، اس لئے کہ میں نے آپ کی بعض یادگار اور مفید تصانیف نہ صرف دیکھی ہیں، بلکہ ان سے استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک استفتاء کا تعلق ہے تو فتوی کے ماہر و محقق تو آپ خود ہیں اور اس سلسلہ میں آپ کے طویل تجربہ نے آپ کو اس مقام تک پہنچادیا ہے جو صحیح معنی میں فقیہ النفس کا مقام ہے [2]

---

[1] البلاغ ص ۴۱۱/۴۱۲ از حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ۔ [2] البلاغ ص: ۴۱۴۔

اس مکتوب میں علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحبؒ کے علم و فضل کی رسمی تعریف نہیں کی بلکہ باقاعدہ آپ کو صحیح معنی میں ''فقیہ النفس'' کا خطاب دیا ہے اور جو لوگ علامہ زاہد الکوثری کے تبحر علم سے واقف ہیں انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے الفاظ کو کسی تصنع یا مبالغہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔[۱]

دراصل حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ فطرتاً ''فقیہ النفس'' تھے۔

اس پر حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور حضرت مجدد الملۃ تھانویؒ جیسے نادر روزگار، فقید المثال فقہاء اور صاحب فتوی بزرگوں کی صحبت و تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔[۲]

(اسی فقاہت نفس کا نتیجہ تھا کہ) اس بات کا بارہا مشاہدہ ہوا کہ کتابوں کی مراجعت سے پہلے آپ ابتداءاً اپنا جو خیال ظاہر فرماتے، کتابوں کی طویل ورق گردانی کے بعد اس خیال ہی کی تائید ہوتی تھی۔

اور اس وقت اندازہ ہوتا تھا کہ اس سوال کو محض احتیاط کی خاطر روکا تھا ورنہ اس کا صحیح جواب اس مذاق سلیم کے پاس موجود تھا۔[۳]

حضرت تھانویؒ کا آپ پر اعتماد[۴]

بعض دفعہ کسی مسئلہ میں جواب لکھا مگر دل مطمئن نہ ہوا تو لکھ دیا کہ:

اس فن کے ماہر ہمارے ملک میں دو بزرگ ہیں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اور حضرت مفتی شفیع صاحب وہاں ضرور بھیج دیں اور جو جواب آئے اسے حق سمجھیں اور مجھے بھی مطلع کر دیں۔

ایک دفعہ ایک عورت کا خط تھانہ بھون میں آیا اپنی مشکل کے حل کا مسئلہ پوچھا،

۱؎ البلاغ ص ۱۴۱۵ از مولانا اشرف خاں صاحب۔ ۲؎ البلاغ از مفتی تقی صاحب مدظلہ۔
۳؎ البلاغ از مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ ۴؎ از مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، البلاغ ص ۱۹۷۔

میری سمجھ میں حل نہ آیا، حضرت قدس سرہ حیات تھے عرض کیا۔

فرمایا: ہاں ہے بہت پیچیدہ، اسے مولوی شفیع صاحب کو بھیج دو، وہاں سے جواب آجائے گا، ایسا ہی کیا، جواب آیا پیش کیا تو بہت پسند فرمایا، اور دعاء دی، اس وقت معلوم ہوا کہ اس فن میں حضرت مفتی صاحب کا کیا درجہ تھا، فن والے کا درجہ ماہر فن ہی جانتا ہے [۱]

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب کے فتاوی کے بارے میں حضرت تھانوی قدس سرہ کا اعتماد حضرت مفتی صاحب کے فتاوی کے لئے اس دور میں سب سے بڑی سند ہے۔

آپ نے متعدد خلفاء کی فقہی تحریروں اور فتاوی میں سب سے زیادہ پسند حضرت مفتی صاحب کی علمی تحقیق کو فرمایا کئی بار اپنے ذاتی معاملات میں ان سے استفتاء فرمایا اور اس پر عمل فرمایا۔

ایک بار اس قسم کے ایک ذاتی معاملہ کے استفتاء کے جواب میں حضرت مفتی صاحب کے فتوی ملنے پر انہیں خط میں ارقام فرمایا:

''آپ کا فتوی ملا، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے، پڑھ کر دو خوشیاں ہوئیں، ایک تو اس کی کہ علم حاصل ہوا۔

دوسرے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے بعد بھی کام کرنے والے موجود ہیں'' [۲]

حضرت مفتی صاحب کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا؟

کسی بھی علم وفن میں کوئی بھی اعلی مقام حاصل کرنے والے اور اس مقام کو خدمت دین اور خدمت خلق کے نقطۂ نظر سے مفید بنانے کے لئے بڑے مراحل سے گذرنا

---

[۱] ازمولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی، البلاغ ص ۱۹۷۔

[۲] البلاغ، ازمولانا محمد اشرف خان صاحب ص ۵۶۱۔

ہوتا ہے، حضرت والد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علوم دین اور بالخصوص فقہ وفتوی میں جو مقام بلند عطا فرمایا، وہ اللہ تعالیٰ کی عطاء خاص کے علاوہ اس طرز عمل کا نتیجہ ہے جو آپ نے اس سلسلہ میں اختیار فرمایا اور اس طرز عمل کا خلاصہ احقر کی ناچیز رائے میں چار چیزیں ہیں۔

(۱) پیہم محنت (۲) للّٰہیت (۳) بزرگوں کی صحبت اور ان سے تربیت حاصل کرنے کا اہتمام (۴) اور غایت احتیاط۔

ان چار باتوں کے مکمل اہتمام کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو فقہ اور فتوی میں وہ مقام بخشا جو ان کے اہل عصر میں سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز تھا[۱]

شعبۂ افتاء اور فتوی نویسی کی اہمیت وافادیت

ایک روز آپ نے فتوی کے ساتھ اس قدر شغف اور انہماک کا سبب خود بیان فرمایا جس سے اس طرز عمل کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

فرمایا: دینی خدمت کے جتنے شعبے ہیں، ان میں سے فتوی وہ شعبہ ہے جس کا فائدہ نقد ظاہر ہوجاتا ہے، انسان تصنیف کرتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے لوگ پڑھیں گے؟

اسی طرح وعظ تقریر کرنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے بیان سے کوئی متاثر ہوکر اس کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرے گا یا نہیں؟

یہی حال تدریس کا ہے کہ طلبہ میں سے کتنے اس سے حقیقی فائدہ اٹھائیں گے، یہ معلوم نہیں ہوتا اس کے برخلاف مفتی کے پاس عموماً وہی شخص سوال بھیجتا ہے جسے دین کی طلب ہوتی ہے اور جو مفتی کے فتوی کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے۔

اور عام طور سے اس پر عمل کر بھی لیتا ہے اس لئے اس کا فائدہ اگرچہ بظاہر محدود ہے لیکن نقد اور متعین ہے، اس کے علاوہ اس خدمت میں شہرت طلبی وغیرہ کے مکائدِ نفس دوسری خدمات کے مقابلہ میں کم ہیں اس لئے اس میں اجر وثواب کی امید زیادہ ہے۔

---

[۱] البلاغ از حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی ص: ۴۱۱۔ [۲] ایضاً ص: ۴۳۰ و ۴۳۱

فقہ وفتاوی کا کام بہت مشکل ہے

حضرت ممدوح مجالس حکیم الامت میں اپنے پیر ومرشد حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں کہ ''مجھے تو تمام علوم وفنون میں فقہ سب سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے''۔[۱]

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل دقیق اور اہم ترین سمجھا گیا ہے، فقہ کی متماثل جزئیات اور ان کے متعلقہ احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے جو کہ ہر عالم ومدرس کے بس کی بات نہیں، جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن وذکاء میں خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادۂ تفقہ نہ ہو۔[۲]

فتوی کی اہلیت کے لئے کسی ماہر مفتی کی تربیت ضروری ہے

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ فتوی کی اہلیت مخصوص فقہی مسائل کو یاد کرنے یا فقہی کتابوں میں استعداد پیدا کر لینے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک مستقل فن ہے جس کے لئے کسی ماہر مفتی کی صحبت میں رہ کر باقاعدہ تربیت لینے کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی نے اس طرح فتوی کی تربیت حاصل نہ کی ہوگی اس وقت تک وہ خواہ دسیوں بار ہدایہ وغیرہ کا درس دے چکا ہو فتوی دینے کا اہل نہیں بنتا۔

علامہ ابن عابد بن شامیؒ نے بھی لکھا ہے کہ کسی ماہر مفتی سے تربیت لئے بغیر فتوی دینا مستند عالم کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔[۳]

---

[۱] البلاغ از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ص ۴۱۸۔ [۲] البلاغ از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ص ۱۱۷۔
[۳] البلاغ از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ص ۴۰۶۔

محض فقہ وفتوی کی کتابیں یاد کر لینے سے فتویٰ کی اہلیت نہیں پیدا ہوتی

حضرت والد صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کر لینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے جنہیں جزئیات ہی نہیں، ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں لیکن ان میں فتوی (نویسی) کی مناسبت نظر نہیں آئی، وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ''فقہ'' کے معنی سمجھ کے ہیں اور فقیہ جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔[1]

وہ کون سے غموض واسرار ہیں جن کے بغیر فتوی کی اہلیت ناتمام رہتی ہے

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب سے بارہا سنی اور ایک آدھ مرتبہ اس کی تشریح وتفصیل بھی سمجھنی چاہی کہ وہ کیا باتیں ہیں جو محض مطالعے یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں، لیکن والد صاحب نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر وہ باتیں بیان میں آسکتیں تو پھر انہیں سیکھنے کے لئے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی، ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدون نہیں کیا جاسکتا اور نہ متعین الفاظ میں ان کی تعبیر وتشریح ممکن ہے۔[2]

---

[1] البلاغ ص ۴۱۸۔ [2] البلاغ ص ۴۱۸۔

ان باتوں کے حصول کا طریقہ

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر اس کے انداز فکر و نظر کا مشاہدہ کیا جائے۔

اس طرح مدت کے تجربے اور مشاہدے سے وہ انداز فکر خود بخود زیر تربیت شخص کی طرف منتقل ہوتا ہے بشرطیکہ جانبین میں مناسبت ہو اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا چاہتا ہو[1]

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا تحقیقی مزاج

آج کل سہولت پسندی کی وجہ سے حال عام طور سے یہ ہو گیا ہے کہ فتوی نویسی کے لئے عموماً ان ہی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے جن کا سوال باقاعدہ آتا ہے لیکن حضرت والد صاحب کی تحقیق و کاوش صرف انہی مسائل کی حد تک محدود نہ تھی جو آپ سے باقاعدہ پوچھے جاتے، اس کے بجائے آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی اور جب کبھی موقع ملتا آپ ان میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے، خواہ اس کے لئے آپ سے سوال نہ پوچھا گیا ہو[2]

حضرت مفتی صاحبؒ کا مطالعہ

یہی وجہ ہے کہ آپ کا مطالعہ صرف شامی عالمگیری یا اسی طرح کی معروف و متداول کتب تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ کتابیں باقاعدہ پڑھی تھیں جنہیں آج کل کے اہل علم کو چھونے کی بھی نوبت نہیں آتی۔

مثلاً امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی ''شرح السیر الکبیر'' وہ کتاب ہے جو باقاعدہ فقہی ابواب

---

[1] البلاغ ص ۴۰۲۔ [2] البلاغ ص ۴۰۲۔

پر مرتب نہیں ہے اس کا اصل موضوع جنگ و صلح، جہاد، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات وغیرہ ہے لیکن ضمناً اس میں بہت سے اہم مسائل دوسرے ابواب سے متعلق بھی آ گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والد صاحب نے اس کا مکمل طور پر یا اس کے بہت بڑے حصہ کا مطالعہ فرمایا تھا، بہت سے بظاہر غیر متعلق مسائل اس کے حوالہ سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔

''شرح السیر الکبیر'' کے اس نسخہ پر جو آپ کے مطالعہ میں تھا جابجا آپ کے قلم سے نوٹ ملتے ہیں [۱]

فقہی رسائل کے دیکھنے اور ان کے جمع کرنے کا اہتمام

فقہ وفتوی کی عام کتابوں کے علاوہ آپ کو ان کتب اور رسائل سے بھی شغف تھا جو کسی خاص مسئلہ کی تحقیق کے لئے لکھے گئے ہوں، چنانچہ آپ علامہ ابن نجیم کے رسائل زینیہ، علامہ شامیؒ کے رسائلِ ابن عابدین، حضرت مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی صاحبؒ، حضرت علامہ ظہیر احسن نیمویؒ اور دوسرے علماء کے مجموعہ ہائے رسائل بڑی احتیاط کے ساتھ رکھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

چنانچہ آپ کی فقہ کی الماری میں کئی خانے اسی قسم کے رسائل سے بھرے ہوئے ہیں اور ان پر آپ کے قلم کی لکھی ہوئی یادداشتوں اور نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض الماری کی زینت ہی نہیں بلکہ آپ کے مطالعہ میں رہے ہیں، گفتگو کے دوران بارہا ایسا ہوتا کہ کسی موضوع پر بات چھڑتی تو آپ فرماتے کہ فلاں عالم نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے اس قسم کے رسائل کبھی کبھار چھپتے ہیں اور ایڈیشن ختم ہونے پر نایاب ہو جاتے ہیں، اس لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو جہاں کہیں اس طرح کا کوئی رسالہ ملتا آپ اسے غنیمت سمجھ کر خرید کر رکھتے تھے اور اگر خریدنا ممکن نہ ہوتا تو اسے

[۱] البلاغ ص:۴۰۲۔

نقل کرانے کا اہتمام کرتے تھے۔

چنانچہ آپ کے پاس متعدد رسائل ایسے ہیں جنہیں خود آپ نے مصروفیات کے غیر معمولی ہجوم کے باوجود خود اپنے قلم سے نقل فرمایا ہے۔[۱]

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دوپہر کو جب مدرسہ میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا ہے تو میں اکثر دارالعلوم کے کتب خانہ میں چلا جاتا وہ وقت ناظم کتب خانہ کے بھی آرام کا ہوتا تھا اس لئے ان کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری وجہ سے چھٹی کے بعد تک بھی کتب خانہ میں بیٹھے رہیں چنانچہ میں نے انہیں باصرار اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ دوپہر کے وقفہ میں جب وہ گھر جانے لگیں تو مجھے کتب خانہ کے اندر چھوڑ کر باہر سے تالا لگا کر جائیں، چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے تھے اور میں ساری دوپہر علم کے اس رنگا رنگ باغ کی سیر کرتا تھا۔

فرماتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو میری نظر سے نہ گذری ہو، اگر کسی کتاب کو میں نے پورا نہیں پڑھا تو کم از کم اس کی ورق گردانی ضرور کرلی تھی۔[۲]

وقت کی قدر و قیمت

حضرت والد صاحب کو وقت کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا اور آپ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے تھے اور حتی الامکان کوئی لمحہ فضول جانے نہیں دیتے تھے۔

آپ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ آپ کے وقت کا کوئی حصہ ضائع چلا جائے، آپ سنت کے مطابق گھر والوں کے ساتھ ضروری اور بسا اوقات تفریحی گفتگو کے لئے بھی وقت نکالتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے دل میں

[۱] مولانا مفتی محمد تقی صاحب مدظلہ البلاغ ص ۴۰۲/۴۰۳۔ [۲] البلاغ ص ۳۶۷۔

کوئی الارم لگا ہوا ہے جو ایک مخصوص حد تک پہنچنے کے بعد آپ کو کسی اور کام کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، چنانچہ گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد آپ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے، سفر ہو یا حضر آپ کا قلم چلتا ہی رہتا، ریل گاڑی میں تو آپ ایسی روانی سے لکھتے تھے جیسے ہموار زمین پر بیٹھے ہوں اور تحریر میں کوئی خاص بگاڑ بھی عموماً پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حد یہ ہے کہ احقر نے آپ کو موٹر کار بلکہ موٹر رکشا تک میں بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا ہے حالانکہ کار اور رکشہ کے جھٹکوں میں کچھ لکھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے مگر آپ ہلکے پھلکے خطوط اس میں بھی لکھ لیتے تھے، آپ اوقات کی وسعت کے لحاظ سے مختلف کاموں کی ایک ترتیب ہمیشہ ذہن میں رکھتے اور جتنا وقت ملتا اس کے لحاظ سے وہ کام کر لیتے جو اتنے وقت میں ممکن ہو، مثلاً اگر گھر میں آنے کے بعد کھانے کے انتظار میں چند منٹ مل گئے تو ان میں ایک خط لکھ لیا ایک روز فرمانے لگے مجھے بے کار وقت گذارنا انتہائی شاق معلوم ہوتا ہے انتہاء یہ ہے کہ جب قضاء حاجت کے لیے بیت الخلاء جاتا ہوں وہاں بھی خالی وقت گذرنا مشکل ہوتا ہے۔[1]

[1] البلاغ ص: ۵۰۵، ۵۰۶، از مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ

باب ۲

متفرق فوائد

قابل تحقیق مسائل کی تحقیق کا خصوصی انتظام

آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی اور جب کبھی موقع ملتا آپ ان میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے خواہ اس کے لیے سوال نہ پوچھا گیا ہو[1]

جہاں (خاص تحقیق کی) ضرورت پیش آتی تو اس خاص فتوی کو الگ کر لیتے اور آپ کے دستی بیگ میں ایک بڑا لفافہ عموماً رکھا رہتا تھا جس پر ''غور طلب فتاوی'' کا عنوان درج تھا، جب کبھی کسی مسئلہ میں شبہ ہوتا تو اس لفافہ میں چلا جاتا[2]

علامہ شامیؒ کی غایت احتیاط

اور بسا اوقات ان کی کتاب سے تسلی نہ ہونے کا راز

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علامہ ابن عابدین شامیؒ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو

[1] البلاغ ص:۴۰۲۔ [2] البلاغ ۴۱۶۔

تو ان کو رفع کرنے کے لیے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں ''تامل'' یا ''تدبر'' کہہ کر بری ہو جاتے ہیں اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتابوں سے مکمل شفا نہیں ہوتی۔

منحۃ الخالق اور فتاویٰ تنقیح الحامدیہ کی خصوصیت

لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ رد المحتار میں تو رہا ہے مگر چونکہ علامہ شامیؒ نے البحر الرائق کا ''حاشیہ منحۃ الخالق'' اور تنقیح الحامدیہ بعد میں لکھا ہے اس لیے ان کتابوں میں مسائل زیادہ منقح انداز میں آئے ہیں جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہو جاتی ہے۔[1]

متون فقہ کی خصوصیات اور فقہی عبارات میں مفہوم مخالف معتبر ہونے کا راز

فقہائے کرام نے فقہ کے جو متون مرتب فرمائے ہیں ان کی عبارتیں انتہائی جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہیں، چنانچہ متون میں کسی مسئلہ کو بیان کرنے کے لیے اتنے ہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جتنے ناگزیر ہوں، ان کا کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا بلکہ اس سے مسئلہ کی کسی نہ کسی شرط کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ قرآن وسنت کی نصوص میں تو مفہوم مخالف کو حجت نہیں مانتے کیونکہ قرآن وسنت کا اسلوب احکام کے بیان کرنے کے ساتھ وعظ و تذکیر کے پہلو کو بھی ساتھ لیے ہے، اور اس میں بعض الفاظ اسی نقطۂ نظر سے بڑھائے

---

[1] البلاغ ص ۴۲۱۔

جاتے ہیں لیکن فقہاء کی عبارتیں صرف قانونی انداز کی عبارتیں ہیں اس لیے ان عبارتوں میں مفہوم مخالف کا معتبر ہونا خود فقہائے حنفیہ نے تسلیم کیا ہے۔[1]

فقہی عبارتوں کو سمجھنے اور ان کا مصداق متعین کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا طرز عمل

فقہاء کے کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے قانونی مقتضیات پر غور کر کے نتیجہ نکالا جائے، لیکن ان الفاظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں بعض اوقات کئی احتمال ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار کرنے میں ایک فقیہ اور مفتی کو اپنی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔

بعض حضرات کسی لفظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں اس کے لغوی مفہوم اور ٹھیٹھ منطقی نتائج کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے مسئلہ کی علت اور اس کا صحیح سیاق پس پشت چلا جاتا ہے اور بعض حضرات اس لفظ کے ٹھیٹھ منطقی نتائج پر زور دینے کے بجائے اس سیاق کو مدنظر رکھتے ہیں، جن میں وہ بولا گیا ہے خواہ اس سے لفظ کے منطقی نتائج پورے نہ ہوتے ہوں ان دونوں میں سے حضرت والد صاحبؒ کا مذاق دوسرے طرز عمل کے مطابق تھا، ایک مثال سے یہ بات واضح ہو سکے گی۔

فقہائے حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر نابالغ کا نکاح اس کے باپ دادا نے کیا ہو تو اسے خیار بلوغ حاصل نہیں ہوتا البتہ اس کے ساتھ ہی ''درمختار'' وغیرہ میں ایک استثناء مذکور ہے کہ:

إلا اذا كان الاب معروفا بسوء اختياره مجانة و فسقاً.

یعنی جب باپ فسق و فجور اور لالچ کی وجہ سے اولاد کی بدخواہی میں معروف ہو تو یہ حکم نہیں ہوگا بلکہ اس صورت میں اولاد کو خیار بلوغ حاصل ہوگا۔

---

[1] البلاغ ص:۴۲۱۔

یہاں فقہاء نے صرف اتنا نہیں فرمایا کہ باپ اولاد کا بدخواہ ہو بلکہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس بدخواہی میں معروف ہو، لہٰذا لفظ ''معروف'' کے قانونی مقتضیات پر عمل تو ضروری ہے لیکن جو حضرات ان قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں لفظ کے ٹھیٹھ منطقی لوازم پر زور دیتے ہیں انہوں نے اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی شخص کو ''معروف بسوء الاختیار'' یعنی اولاد کی بدخواہی میں معروف اسی وقت کہا جائے گا جب اس نے کم از کم ایک مرتبہ اپنی کسی اولاد کا نکاح صرف لالچ کی بناء پر کر دیا ہو اور جس شخص نے اب تک اپنی کسی لڑکی کا نکاح اس طرح نہ کیا ہو وہ معروف بسوء الاختیار نہیں کہلا سکتا۔

لہٰذا اگر کوئی باپ پہلی بار اپنی لڑکی کا نکاح لالچ سے کر رہا ہو تو وہ سیِّءُ الاختیار تو ہے لیکن معروف بسوء الاختیار نہیں ہے اس لیے اس کی لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہوگا۔

ہاں اگر وہ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نکاح اسی طرح کرے تو چونکہ اب وہ معروف بسوء الاختیار بن گیا ہے اس لیے دوسری لڑکی کو خیار بلوغ مل جائے گا۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ نے جواہر الفقہ کے ایک رسالہ میں اس نقطۂ نظر سے اختلاف فرمایا ہے، ان کا موقف یہ ہے کہ ''معروف بسوء الاختیار'' کی یہ منطقی تعبیر کہ جب تک کسی لڑکی کی کم از کم ایک بہن باپ کی بدخواہی کی بھینٹ نہ چڑھ چکی ہو اس وقت تک اسے خیار بلوغ حاصل نہ ہو، اس سیاق کے بالکل خلاف ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سیاق یہ ہے کہ اولاد کا خیار بلوغ باپ کی مظنونہ شفقت کے مدنظر ساقط کیا گیا تھا لیکن جب سوء اختیار سے اس شفقت کا فقدان ثابت ہو گیا تو خیار بلوغ لوٹ آئے گا۔

اس موقع پر فقہاء نے معروف بسوء الاختیار اس لیے استعمال کیا ہے کہ سوء اختیار کا فیصلہ کسی کی شخصی رائے سے نہیں ہونا چاہیے بلکہ باپ کی بدخواہی اتنی واضح ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں میں اس حیثیت سے معروف ہو۔[1]

---

[1] البلاغ ص ۴۲۱ تا ۴۲۳۔

فقہ کے مشکل ابواب سے کامل مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ

احقر نے حضرت والد صاحب قدس سرہ سے خود سنا ہے کہ فقہ کے جو ابواب مجھے جتنے زیادہ مشکل معلوم ہوئے میں نے ان کی تحصیل میں اتنی ہی زیادہ کاوش کی، چنانچہ فرماتے تھے کہ مجھے شروع میں وقف کے مسائل سے زیادہ مناسبت نہیں تھی اور جب کبھی وقف کا کوئی سوال آتا تو مجھے اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی، اس کا علاج میں نے اس طرح کیا کہ وقف کے بارے میں جتنی کتابیں میسر آئیں ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرلیا، فقہ کی متداول کتب کے علاوہ امام خصاف کی ''کتاب الوقف'' اور ''الاسعاف فی حکم الاوقاف'' کا بھی مطالعہ کیا یہاں تک کہ میری عدم مناسبت انشراح میں تبدیل ہوگئی۔

اور اللہ تعالیٰ نے جن ابواب سے مجھے خصوصی مناسبت عطا فرمائی ان میں وقف بھی شامل ہے اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کی کتابوں میں سے جس کتاب نے وقف کے مسائل کو سب سے زیادہ شرح وبسط اور انضباط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ''فتاوی مہدویہ'' ہے۔[1]

مفتی کے لیے ایک بیاض خاص کی ضرورت اور اس کی اہمیت

فتویٰ کے کام میں یہ صورت حال اکثر پیش آتی ہے کہ انسان کسی ایک مسئلہ کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے اور مطلوبہ مسئلہ نکلنے سے پہلے اس میں بہت سے دوسرے کارآمد مسائل نظر آجاتے ہیں لیکن چونکہ اس وقت ان کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس لیے ان کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی اور مطلوبہ مسئلہ کی تلاش میں انہیں نظر انداز کرکے گذر جاتا ہے بعد میں جب کبھی ان مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے تو یاد کرتا ہے کہ یہ مسئلہ کہیں دیکھا ہے لیکن کیا؟ اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔

حضرت والد صاحب نے اس غرض کے لیے ضخیم بیاض بنائی ہوئی تھی اور اس کو

---

[1] البلاغ ص: ۴۰۲۔

فقہی ابواب پر مرتب کر کے ہر باب کے عنوان کے تحت کئی کئی صفحات سادے چھوڑ دیتے تھے اور طریقۂ کار یہ تھا کہ جب کبھی مطالعہ کے دوران کوئی اہم مسئلہ یا نئی تحقیق نظر پڑتی تو اس کا خلاصہ یا کم از کم حوالہ اس بیاض میں متعلقہ باب کے تحت نوٹ کر لیتے تھے۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ اس کی پابندی تو نہ کر سکا کہ جب بھی کوئی اہم مسئلہ یا تحقیق نظر پڑے تو اس کا حوالہ ضرور درج کر لیا کروں لیکن ایک زمانہ تک اکثر و بیشتر اس پر عمل کرتا رہا، اس طرح آپ کے پاس نادر یادداشتوں اور حوالوں کا بڑا گرانقدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا اور ضرورت کے وقت اس میں بہت سی کام کی باتیں یا مفید حوالے مل جاتے تھے۔

جب ہم لوگوں نے فراغت کے بعد حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں فتویٰ نویسی کی تربیت لینی شروع کی تو حضرتؒ نے ہمیں بھی یہ نصیحت فرمائی تھی کہ اپنے پاس ایک ایسی بیاض بنا رکھیں، چنانچہ ہم نے بھی اس پر عمل کیا اور باوجودیکہ اس میں اندراجات کا التزام نہ ہو سکا لیکن جتنا کچھ ہوا اس کے فوائد محسوس کیے [1]

---

[1] البلاغ ص:۴۰۶۔

باب ۳

آداب فتویٰ

فتویٰ لکھنے سے پہلے چند قابل لحاظ امور

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح کسی مسئلہ کا حکم معلوم کرنا ایک اہم کام ہے اسی طرح فتوی نویسی ایک مستقل فن ہے، جس میں مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔

مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابل جواب ہے یا نہیں اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ اپنے مخالف کو زیر کرنا ہے۔

یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہوسکتا ہے ایسی صورت میں استفتاء کے جواب سے گریز کرنا مناسب ہوتا ہے مثلاً ایک مرتبہ سوال آیا کہ ہمارے مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انہیں ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟

سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے حضرت والد صاحب کو یہ غالب گمان ہوگیا کہ اس استفتاء کا مقصد امام صاحب کو حق کی دعوت دینا یا فہمائش کرنا نہیں بلکہ ان کی تحقیر اور ان کے بعض خلافِ احتیاط امور کی تشہیر ہے چنانچہ حضرت والد صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کے ہیں ان سے کہئے وہ تحریراً یا زبانی معلوم فرمالیں۔

اس طرح یہ ممکنہ فتنہ فرو ہو گیا۔[1]

(۲) اسی طرح حضرت والد صاحبؒ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو ان کی ہمت شکنی کی جائے، کیونکہ ایک عرصہ سے لوگوں میں یہ مزاج ابھرا ہے کہ دین کے وہ عملی مسائل جن پر زندگی کی درستی اور آخرت کی نجات موقوف ہے ان سے تو غافل اور بے خبر رہتے ہیں اور بے فائدہ نظریاتی بحثوں میں نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر باقاعدہ محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جن سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ ایسے سوالات کے جواب میں فتویٰ لکھنے کے بجائے ایسی نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پیدا ہو مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا یزید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہئے۔

ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کی کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا کہ کیا وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہو گئے؟

آپ نے فرمایا مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں؟ غرض اگر عوام کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضۂ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا یا نہیں؟ اصحاب کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مومن تھے یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات طاہر تھے یا نہیں؟

اور والد صاحب کو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سوالات بلا ضرورت محض بحث و مباحثہ کی خاطر پوچھے جا رہے ہیں تو عموماً آپ ان کا جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے کہ ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان و عمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، ان مسائل پر بحث

---

[1] البلاغ ص: ۴۲۴۔

ومباحثہ میں وقت صرف کرنے کے بجائے وہ کام کیجئے جو آخرت میں کام آئے اور بعض اوقات صرف اتنے جواب پر اکتفاء فرماتے کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہ مَا لَا یَعْنِیْہِ''۔

یعنی انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے۔

ایک مرتبہ ملک میں ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے مسئلہ پر بحث ومباحثہ کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ بستی بستی مناظرے منعقد ہونے لگے اور فریقین کی طرف سے مناظرانہ کتابوں کا ایک انبار تیار ہوگیا، حضرت والد صاحب کے پاس اس مسئلہ پر سوالات کی بھرمار ہوئی تو اس زمانہ میں آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ: اگر سوال کسی ذی علم کی طرف سے آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اس کا مقصد اپنے کسی شبہ کو دور کرنا یا واقعۃً علمی تحقیق کرنا ہے تو آپ اس کا جواب حسب ضرورت اجمال یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے، لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے ان کا جواب یہ دیتے کہ مسئلہ کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لیے کوئی ضروری نہیں لہٰذا اس بحث میں پڑنے کے بجائے شریعت کے عملی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجئے۔[۱]

(۳) اسی طرح آپ نے بارہا فرمایا کہ مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اس کے فتوے کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا، چنانچہ بعض اوقات کسی مسئلہ کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے لیکن اس کی کھلی چھوٹ دے دینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی اور لوگ اپنی حدود پر قائم نہیں رہیں گے ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔[۲]

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتویٰ کے بجائے مشورہ کے طور پر لکھنا چاہئے، ایسے موقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ ''فلاں عمل مناسب نہیں یا درست نہیں یا اس سے پرہیز کرنا چاہئے''۔

---

[۱] البلاغ ص: ۴۲۵۔ [۲] البلاغ ص: ۴۲۶۔

حالات وزمانہ کے بدل جانے سے حکم بدل جانے کی حقیقت

اسی ذیل میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اس قسم کے فتوے بعض اوقات زمانوں کے اختلاف سے بالکل بدل جاتے ہیں اس کی بنا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء اپنی مرضی سے احکامِ شریعت میں ردوبدل کرتے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ شرعی احکام کی بتدیلی نہیں ہوتی بلکہ حالات کے لحاظ سے نسخے اور تدبیر کی تبدیلی ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ سے کسی نے کہا کہ حضرت یہ کیا بات ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا تو اکابر علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کے فتوے دیئے۔

لیکن آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ مفاسد سے اجتناب کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں اس کے جواب میں حضرت علامہ عثمانیؒ نے جو بات ارشاد فرمائی وہ لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔

فرمایا کہ یہ شرعی حکم کی تبدیلی نہ تھی بلکہ بات یہ ہے کہ جب کسی علاقہ پر کسی وبا کے مسلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اطباء ایسی تدبیریں بتاتے ہیں جن سے اس وبا کو روکا جاسکے۔

لیکن جب وبا آجاتی ہے تو پھر معالجوں کی تدبیر بدل جاتی ہے اور اس وقت ایسے نسخے بتائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ وہ بیماری آنے کے بعد شفا حاصل ہو، بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہوا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جدید علوم وفنون یا کسی زبان کی تحصیل کو بذاتِ خود کبھی کسی نے حرام نہیں کہا لیکن اس وقت چونکہ علماء کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ علوم وفنون یا انگریزی زبان تنہا نہیں آئیں گے بلکہ ملحدانہ عقائد ونظریات اور دین بیزاری کی وبا ساتھ لائیں گے جس کا مشاہدہ بعد میں سب کو ہوگیا، اس لیے شروع میں انہوں نے اس وبا کو روکنے کی تدبیر کی اور بہت سے مسلمانوں کا ایمان بچالیا لیکن جب

وبا عالمگیر ہوگئی تو پھر تدبیر بدل گئی اور وہ یہ کہ ان علوم وفنون یا اس زبان کو حتی الوسع ان بیماریوں سے پاک کرکے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، غرض یہ مختلف حالات کی مختلف تدبیریں تھیں، ٹھیٹھ معنی میں شرعی حکم کی تبدیلی نہیں [۱]

فتوے کی عبارت عام فہم ہونا چاہئے جس کو مستفتی بآسانی سمجھ سکے

حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فتوی نویسی کے انداز میں بھی عام روش سے ہٹ کر اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اہم تبدیلیاں فرمائی ہیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کو یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ اس فتوے کو مخاطب ٹھیک ٹھیک سمجھ لے اور نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو، پہلے زمانہ میں چونکہ علم دین کا چرچا تھا اور علماء کی کثرت تھی اس لیے لوگ علمی فقہی اصطلاح واسلوب سے اتنے نامانوس نہ تھے، چنانچہ مفتی صاحب اپنے جواب میں بلا تکلف فقہی اصطلاحات استعمال کرلیتے تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا تھا، اس لیے بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا اور اگر کوئی بات خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے لوگ تھے جو اسے فتوی کا مطلب سمجھا سکیں۔

اب ہماری شامت اعمال سے حالت یہ ہوگئی ہے کہ علم دین اور فقہ سے مناسبت باقی نہیں رہی اور اہل علم کی تعداد بھی کم ہوگئی ہے اس لیے اب اگر سوال کرنے والا کوئی عام آدمی ہو تو جواب کی عبارت اس کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہئے۔

مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملے لکھتے رہے ہیں کہ:

"مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقہ پر تقسیم ہوگا"۔

[۱] البلاغ ص: ۴۲۷۔

اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوتا تھا لیکن اب اگر یہ جملہ کسی گریجویٹ بلکہ پی ایچ ڈی کے سامنے بھی آ جائے تو وہ اس کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا اور اس سے میراث کی تقسیم میں خلل واقع ہوسکتا ہے۔

اول تو آج لوگوں کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ میت کے ترکہ میں کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں چنانچہ عام طور سے میت کے ذاتی استعمال کی چھوٹی موٹی چیزوں بلکہ بعض اوقات گھر کے ساز وسامان تک کو ترکہ کی تقسیم میں شامل نہیں کیا جاتا، پھر نہ لوگوں کو حقوق متقدمہ علی الارث کا مطلب معلوم ہے اور نہ ان کے مصداق کا پتہ ہے اس لیے حضرت والد صاحبؒ نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی کہ:

''صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی زیور یا جائداد یا چھوٹا بڑا اسامان چھوڑا ہو اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز وتکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں پھر اگر مرحوم کے ذمہ کچھ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے اور بیوی کا مہر اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ بھی دین میں شامل ہے، اس کو ادا کیا جائے۔

پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر کے حق میں کی ہو تو (ایک بٹا تین) ۱/۳ کی حد تک اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد جو ترکہ بچے اسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے''۔

یہ تو ایک مثال تھی ورنہ حضرت والد صاحب نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف فتوی کی شوکت اور فقہی باریکیاں برقرار رہیں، اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے، چنانچہ جو حضرات آپ سے فتوی کی تربیت لیتے ان کو بھی آپ اس بات کی تاکید فرماتے اس کی باقاعدہ مشق کراتے اور ان کی عبارت کی اصلاح پر کافی وقت خرچ کرتے تھے۔[1]

[1] البلاغ ص: ۴۲۸۔

مفصل فتویٰ لکھنے کا طریقہ

مفصل فتووں میں بعض اوقات مسئلہ کے احکام، اس کے دلائل اور شبہات کے جوابات اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن الجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات پورے فتویٰ کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا، حضرت والد صاحبؒ کا انداز فتویٰ نویسی جس کی آپ دوسروں کو بھی تاکید فرماتے تھے اس سے مختلف تھا۔

آپ فرماتے تھے کہ فتویٰ میں مسئلہ کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئے تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کرلے اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے، فتوے میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے اور دلائل اہل علم کے لیے ہوتے ہیں، اس لیے ایک عام آدمی کو فتوے کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور سے معلوم ہونی چاہئے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصراً جواب کیا ہے؟

اس جواب کے بعد اہل علم کے لیے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جوابات جتنی تفصیل سے چاہیں دے دیئے جائیں۔

چنانچہ حضرت والد صاحبؒ کے فتوؤں میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ فتوے کے شروع یا اخیر میں بالکل نمایاں اور ممتاز طریقہ پر مسئلہ کا واضح جواب لکھ دیتے ہیں اور زیادہ تر یہ جواب شروع میں ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ قدیم فقہاء اور مفتی حضرات کا طریقہ یہی تھا اور ایک روز غالباً حضرت شاہ جلال صاحب تھانیسری کے بعض فتاویٰ دکھائے جو اپنے موضوع پر مفصل فتاوی تھے لیکن ان کا طریقہ یہی تھا کہ سائل نے کسی چیز کے بارے میں

یہ پوچھا تھا کہ ھَلْ یَجُوزُ؟ اس پر حضرت شاہ جلال صاحب نے شروع میں لکھا تھا ”الجواب، نعم یجوز“ اور اس کے بعد دلائل کی مفصل بحث فرمائی تھی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اس کو بطور مثال پیش کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب ہے کہ پڑھنے والے کو سوال کا جواب ایک ہی لفظ سے مل گیا، اب اگر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے اور نہیں پڑھنا چاہتا ہے تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لیے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہیں [1]

سوال کے تجزیہ و تنقیح کی ضرورت

اسی طرح سوال بعض اوقات تہ در تہ ہوتا ہے اور سوال کرنے والا تمام باتوں کو گڈمڈ کر کے پوچھتا ہے۔

ایسے مواقع پر حضرت والد صاحبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جواب میں پہلے سوال کا تجزیہ خود فرما لیتے اور یہ تنقیح فرما دیتے کہ اس مسئلہ میں فلاں فلاں باتیں قابل غور ہیں پھر ان میں سے ہر ایک پر نمبر وار بحث فرماتے تھے۔ اس طرح مسئلے کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتے تھے، اور مسئلے کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی تھی [2]

غایت درجہ تحقیق واحتیاط کی ضرورت

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل دقیق ترین سمجھا گیا ہے فقہ کی متماثل جزئیات اور ان کے متعلقہ احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا تفاوت محسوس کرنا عمیق علم کو چاہتا ہے جو کہ ہر عالم و مدرس کے بس کی بات نہیں جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن وذکاء میں خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادۂ تفقہ نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب مکمل تحقیق کے باوجود استفتاء کے جوابات

---

[1] البلاغ ص:۴۲۷۔ [2] ایضاً ص:۴۲۷ تا ۴۳۰۔

تحریر فرمانے میں غایت احتیاط سے کام لیا کرتے تھے۔[۱]

نیز حضرت مفتی صاحب جب تک مسئلے کی پوری تحقیق نہ فرمالیتے اور اس تحقیق پر مکمل شرح صدر نہ ہوجاتا فتویٰ صادر نہ فرماتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اجتناب کا حکم صادر فرماتے۔[۲]

اگر حضرت مفتی صاحب کو کسی مسئلہ میں تردد یا شبہ ہوجاتا تو سائلین کو دوسرے ائمہ فقہ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے مسئلہ دریافت کرکے عمل کرنے کی ترغیب فرماتے۔[۳]

خود بھی بعض مسائل میں دوسرے علماء سے استفادہ فرمایا کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے ذاتی مسائل میں تو اکثر رجوع فرمایا کرتے تھے۔[۴]

خودرائی سے اجتناب اور بڑوں و ہمعصروں سے مشورہ کی ضرورت

خودرائی اور خود بینی سے والد صاحب کو سخت نفرت تھی، روز مرہ کے عام معاملات میں بھی اپنے چھوٹوں تک سے مشورہ لینے کے عادی تھے خصوصاً فتویٰ جو دنیا و آخرت کی نازک ذمہ داری تھی اس میں تو سبھی بزرگوں سے اور خصوصاً حضرت حکیم الامتؒ سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع فروگذاشت نہ فرماتے تھے۔ [۵]

حضرت والد صاحب حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی یہ گرانقدر نصیحت بار بار سنایا کرتے تھے کہ جب تک تمہارے ضابطہ کے بڑے موجود ہوں ان سے استصواب کیے (یعنی ان سے رائے و مشورہ لیے) بغیر کبھی کوئی اہم کام نہ کرو اور جب ضابطہ کے بڑے نہ رہیں تو اپنے معاصرین اور برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، چنانچہ ساری عمر والد صاحب کا عمل اسی کے مطابق رہا۔

[۱] البلاغ ص:۱۲۰۔ [۲] البلاغ ص:۱۲۰-۱۳۰۔ [۳] البلاغ ص:۲۵۰۔ [۴] البلاغ ص:۲۸۰۔ [۵] ۱۷۱

یہ معمول دوسرے معاملات میں تو تھا ہی لیکن کسی نئے فقہی مسئلہ کی تحقیق کرنی ہو تو اس میں اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم اور جواہر الفقہ میں مختلف فقہی مسائل پر جو فقہی رسالے موجود ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کے آخر میں اس زمانہ کے معروف اہل فتویٰ اور اہل علم کی تصدیقات ساتھ لگی ہوئی ہیں [۱]

اختلاف کے باوجود ادب واحترام

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو اللہ جل شانہ نے بڑا وسیع القلب اور وسیع النظر بنایا تھا، آپ اپنی تحقیق کے ساتھ دوسرے اکابرین اور ہمعصر علماء کی تحقیق کو نقل کرنا اپنی سعادت سمجھتے اور انہیں اسی طرح شائع بھی فرمادیا کرتے تھے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے جواہر الفقہ)۔

نیز حضرت والا بعض علماء سے فقہی اختلاف کے باوجود ان کی کتب وفتاویٰ کے حوالے اپنے فتاوی کی تائید میں پیش فرمایا کرتے تھے۔ [۲]

مولانا لکھنوی سے شدید اختلاف کے باوجود آپ اپنے فتاویٰ کی تائید میں ان کے اقوال اور ان کی تصانیف کی عبارتیں پیش فرماتے ہیں اور مولانا لکھنوی کے لیے فرماتے ہیں کہ **كذا قال مولانا المحقق عبدالحی لکھنوی فی مجموعة الفتاوىٰ.** [۳]

---

[۱] البلاغ ص:۴۰۹۔ [۲] البلاغ ص:۷۲۷۔ [۳] البلاغ ص:۷۳۱

فصل

ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں

"قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّی"

امام جصاصؒ نے اس جواب سے یہ مسئلہ نکالا کہ مفتی اور عالم کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ سائل کے ہر سوال اور اس کی ہر شق کا جواب ضرور دے بلکہ دینی مصالح پر نظر رکھ کر جواب دینا چاہیے جو جواب مخاطب کی فہم سے بالاتر ہو یا اس کے غلط فہمی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو تو اس کا جواب نہیں دینا چاہیے۔

اسی طرح بے ضرورت یا لایعنی سوالات کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے البتہ جس شخص کو کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس کے متعلق اس کو کچھ عمل کرنا لازم ہے اور خود وہ عالم نہیں تو مفتی اور عالم کو اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ (جصاص)

امام بخاری نے کتاب العلم میں اس مسئلہ کا ایک مستقل ترجمۃ الباب رکھ کر بتلایا ہے کہ جس سوال کے جواب سے مغالطہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اس کا جواب نہیں دینا چاہیے۔[1]

غیر ضروری تحقیقات اور اختلافی مسائل میں طویل بحثوں سے اجتناب

فَلاَ تُمَارِ فِیهِمْ اِلاَّ مِرَآءً ظَاهِراً وَّلاَ تَسْتَفْتِ فِیهِمْ مِّنْهُمْ اَحداً.

(کهف پ: ۱۵)

یعنی آپ اصحاب کہف کی تعداد وغیرہ کے متعلق ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں کاوش نہ کریں بلکہ سرسری بحث فرما دیں اور ان لوگوں سے آپ خود بھی کوئی سوال اس

[1] معارف القرآن بنی اسرائیل ۵/۵۱۶

کے متعلق نہ کریں کیونکہ جتنی بات ضروری تھی وہ وحی میں آ گئی، غیر ضروری سوالات اور تحقیقات شانِ انبیاء کے خلاف ہے۔

ان دونوں جملوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی وہ در حقیقت علماء امت کے لیے اہم رہنما اصول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف پیش آئے تو جس قدر ضروری بات ہے اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں مزید بحث و تکرار میں وقت کی اضاعت ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت دوسرے جملہ میں یہ دی گئی ہے کہ اصحاب کہف کی زائد تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے یا ان کو رسوا کرنے کے لیے سوال کیا جائے یہ بھی اخلاق انبیاء کے خلاف ہے اس لیے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا یعنی تحقیق مزید کے لیے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لیے ہو[1]

بے ہودہ سوالوں کے جواب میں حلم وصبر کی ضرورت

آیات مذکورہ (لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ☆) میں جو سوالات اور فرمائش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ایمان لانے کی شرط قرار دے کر کی گئیں وہ سب ایسی ہیں کہ ہر انسان ان کو سن کر ایک قسم کا تمسخر اور ایمان نہ لانے کا بیہودہ بہانے کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا، ایسے سوالات کے جوابات میں انسان کو

[1] معارف القرآن سورۂ کہف ۵/۵۶۸۔ ☆ بنی اسرائیل پ ۱۵

فطرتاً غصہ آتا ہے اور جواب بھی اسی انداز سے دیتا ہے مگر ان آیات میں ان کے بیہودہ سوالات کا جو جواب حق تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو تلقین فرمایا وہ قابل نظر اور مصلحین امت کے لیے ہمیشہ یاد رکھنے اور لائحہ عمل بنانے کی چیز ہے کہ ان سب کے جواب میں نہ ان کی بیوقوفی کا اظہار کیا گیا نہ ان کی معاندانہ شرارت کا، نہ ان پر کوئی فقرہ کسا گیا بلکہ نہایت سادہ الفاظ میں اصل حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تم لوگ شاید یہ سمجھتے ہو کہ جو شخص خدا کا رسول ہو کر آئے وہ سارے خدا کے اختیارات کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہو یہ تخیل غلط ہے، رسول کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔[1]

تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا الخ۔

قرآن نے اس جگہ تقلید آبائی کے خوگر لوگوں کی غلطی کو واضح فرمایا اور اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک خاص مؤثر طریقہ بھی بتلا دیا جس سے مخاطب کی دل آزاری یا اس کو اشتعال نہ ہو، کیونکہ دین آبائی کی تقلید کرنے والوں کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ کیا تمہارے باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہو سکتی ہے جب کہ باپ دادا نہ علم رکھتے ہوں نہ عمل۔[2]

علمی تنقید کی اجازت ہے مگر طعن و تشنیع ممنوع ہے

طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (سورۂ توبہ پ:۱۰) کے لفظ سے بعض حضرات نے اس پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کے دین پر طعن و تشنیع کرنا عہد شکنی میں داخل ہے۔ جو شخص اسلام اور شریعت اسلام پر طعنہ زنی کرے اس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہیں رہ سکتا۔

مگر باتفاق فقہاء اس سے مراد وہ طعن و تشنیع ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی اہانت

---

[1] معارف القرآن سورۂ کہف ۵/۵۲۰، بنی اسرائیل۔ [2] معارف القرآن سورہ توبہ ۴/۳۲۵۔

اور تحقیر کے طور پر اعلاناً کی جائے۔ احکام ومسائل کی تحقیق میں کوئی علمی تنقید کرنا اس سے مستثنیٰ ہے اور لغت میں اس کو طعن وتشنیع کہتے بھی نہیں۔ اس لیے دار الاسلام کے غیر مسلم باشندوں کو علمی تنقید کی تو اجازت دی جاسکتی ہے مگر اسلام پر طعنہ زنی اور تحقیر وتوہین کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے[1]

ہٹ دھرمی کے وقت الزامی جواب دینا مناسب ہے

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلآئِکَۃَ اِنَاثًا وَّھُمْ شَاھِدُوْنَ. (سورۂ صفّت پ:۲۳)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہوں ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے، الزامی جواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود انہی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے، اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ بھی غلط ہوتا ہے لیکن مخالف کو سمجھانے کے لیے اس سے کام لیا جاتا ہے، یہاں باری تعالیٰ نے ان کے عقیدے کی تردید کے لیے خود انہی کے نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود باعث ننگ وعار ہے ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیوں کا وجود باعث ننگ ہے، نہ یہ مطلب کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجائے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا بلکہ یہ الزامی جواب ہے جس کا مقصد خود انہیں کے مزعومات سے ان کے عقیدے کی تردید کرنا ہے ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی ہے جو قرآن کریم ہی میں کئی جگہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور اسے نہ کسی اولاد کی ضرورت ہے اور نہ اس کی رفعت شان کو یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو[2]

---

[1] معارف القرآن سورۂ توبہ ۴/۳۲۴۔ [2] معارف القرآن صفت ۷/۴۸۴۔

اگر اپنے فتوے اور دوسروں کے فتوؤں میں اختلاف ہوجائے

اگر آپ کے فتویٰ سے کسی عالم کو اختلاف ہوتا تو آپ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرماتے اور بعض مرتبہ اختلاف کا ذکر بھی فرماتے بلکہ ان کی مفصل تحریر اپنے فتوے کے ساتھ منسلک فرما کر شائع کردیا کرتے تھے۔

اگر حضرت مفتی صاحب کے فتوی سے کسی کو اختلاف ہوتا اور وہ آپ کے فتویٰ کے خلاف عمل کرتا تو آپ اس سے بالکل ناگواری کا اظہار نہ فرماتے بلکہ بعض جگہ خود موصوفؒ اپنی تحقیق انیق کے بعد تحریر فرمادیا کرتے کہ کسی کو اس سے اختلاف ہو وہ دوسرے علماء سے تحقیق کرکے اس پر عمل کریں۔[1]

اگر حضرت مفتی صاحب کو اپنے فتوے اور اکابرین کے فتاوی میں اختلاف ہوجاتا تو اپنے فتوے کو ترجیح دینے کے بجائے لکھ دیتے کہ سائل کو اختیار ہے جس کے فتوے پر دیانۃً اعتماد ہو، اس پر عمل کرے یا مزید تحقیق کرکے جو راجح ہو اس پر عمل کرے۔[2]

سخت اور متعصّبانہ الفاظ سے احتراز

آپ کی تصانیف وتحریرات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ نے مسائل کے اختلاف میں کبھی سخت متعصّبانہ الفاظ نہیں استعمال کیے، ذاتیات سے ہمیشہ دامن بچایا اور کبھی ایسا انداز بیان اختیار نہیں فرمایا جس سے دوسرے عالم کی توہین وتذلیل ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اختلافات میں آپ بہت محتاط الفاظ استعمال فرماتے تھے اور وہ اختلافات صرف مسئلے کی حد تک ہوتے تھے۔ تلخیٔ کلام کی نوبت نہیں آتی تھی اور اختلاف رائے پر کبھی غصہ یا ناگواری کا اظہار نہ فرماتے تھے اگرچہ اختلاف کرنے والا آپ کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب جو کئی سال تک حضرت کے زیر سایہ فتاوی

---

[1] البلاغ ص: ۲۴۷۔ [2] البلاغ ص: ۲۶۷۔

کے جوابات دیتے رہے فرماتے ہیں۔

''احقر کو بہت سی جگہ اختلاف رائے بھی ہوتا، بندہ عرض کر دیتا کہ یہ جواب آپ کی رائے کے مطابق لکھ دیا ہے آپ دستخط فرما دیں، میں دستخط نہیں کروں گا، میری گذارش بشاشت سے قبول فرماتے اور دستخط فرما دیتے؟[۱]

شیخ سے فقہی اختلاف

نیز آپ نے بعض مسائل میں اپنے شیخ و مربی حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے فقہی اختلاف فرمایا ہے جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ سے فقہی اختلاف اپنے نفس کی اصلاح میں مانع نہیں اور شیخ کو بھی مرید کے فقہی اختلاف سے اظہار ناراضگی یا انقباض نہ ہونا چاہیئے، بلکہ شیخ کی اپنی غلطی ہو تو اس سے رجوع ہو جانا چاہیئے جیسا کہ حضرت تھانویؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ کا طرز عمل تھا (جس کی تفصیل جواہر الفقہ میں موجود ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کا مذاق یہ تھا کہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود طعن و تشنیع اور دل آزار اسلوبِ بیان سے مکمل پرہیز کیا جائے[۲]

مداہنت سے کلی اجتناب

لیکن اس نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ حق کو حق یا باطل کو باطل کہنے میں مداہنت سے کام لیا جائے کیونکہ کفر کو کفر تو کہنا ہی پڑے گا کیونکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے ضروری اظہار کے بعد محض اپنی نفسانیت کی تسکین کے لیے فقرہ بازیاں نہ کی جائیں، حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ داعیٔ حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہیئے کہ اس کو چھو کر دیکھو تو اتنا نرم ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو لیکن اگر اسے کوئی توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز

---

[۱] البلاغ ص:۳۰۷۔ [۲] البلاغ ص:۴۶۸۔

دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے، چنانچہ مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحبؒ حق کے معاملہ میں ادنیٰ لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا جس سے عناد کے بجائے دلسوزی، حق پرستی اور للّٰہیت مترشح ہوتی تھی [1]

حق پرستی وانصاف پسندی

علم وتحقیق کے سفر میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں ایک طالب علم کو دوسرے طالب علم سے اختلاف کرنا پڑتا ہے اور بعض مقامات پر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف کرنا پڑتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت والد صاحب کا طرز عمل یہ تھا کہ نہ تو کسی کا ادب واحترام اس سے اختلاف رائے کے اظہار میں مانع ہوا اور نہ کبھی اختلاف رائے نے ادب و احترام میں ادنیٰ رخنہ اندازی کی، آپ نے بعض مسائل میں بھی اختلاف کیا بلکہ اپنے شیخ ومربی حکیم الامت حضرت تھانوی سے بھی چند فقہی مسائل میں اختلاف رائے رہا، اور خود حضرت نے آپ سے یہ فرمایا کہ تمہارے دلائل پر مجھے شرح صدر نہیں ہوتا اور میرے دلائل پر تمہیں شرح صدر نہیں، اس لیے دونوں اپنے اپنے موقف پر رہیں تو کچھ حرج نہیں ہے [2]

اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی عظمت وعقیدت آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ آپ نے کبھی اس عقیدت کو مسائل کی تحقیق وتنقید میں حائل نہیں ہونے دیا، اور نہ کبھی اپنی تنقید سے کسی کی عظمت وعقیدت پر حرف آنے دیا، ایسا کرنا مشکل ضرور ہے لیکن اس مشکل کو آپ نے جس خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ اہل علم کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے [3]

اس سلسلہ کی جو خط وکتابت ''مکاتیب حکیم الامت'' میں محفوظ ہے وہ تحقیق وتنقید،

---

[1] البلاغ ص: ۴۶۹۔ [2] البلاغ ص: ۴۹۴۔ [3] البلاغ ص: ۱۷۱-۱۷۲۔

بے نفسی اور حق پرستی کا ایسا جیتا جاگتا نمونہ ہے کہ آج کل کی دنیا میں اس کی مثالیں نایاب ہیں۔

آج کل تو دعووں اور اظہار برتری کا نام علمی تحقیق رکھ دیا ہے اور حملہ بازی اور دوسرے کی تنقیص وتذلیل کو "تنقید" کا مقدس نام دے دیا گیا ہے جو بات ایک مرتبہ زبان سے نکل گئی پتھر کی لکیر بن کر وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے لیکن یہ سب باتیں نفسیات کی پیداوار ہیں اور جہاں فریقین کا مقصود ہی حق کی تلاش ہو وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کہنے والا میری رائے کے موافق کہہ رہا ہے یا مخالف، وہاں نظر اس پر رہتی ہے کہ کس دلیل سے کہہ رہا ہے۔

چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ کے یہاں جو فتاویٰ کا سلسلہ جاری تھا ان میں آپ نے ایک مستقل "ترجیح الراجح" کا باب رکھا تھا۔ اس باب میں وہ فتاویٰ درج کئے جاتے تھے جن سے حضرت نے کسی کی توجہ دلانے سے یا خود ہی تحقیق بدل جانے کے باعث رجوع کرلیا ہو، سلف صالحین، صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کا یہی رنگ تھا اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی [۱]

بڑوں سے اختلاف رائے کا طریقہ

ایسے مواقع پر حضرت والد صاحب کا عام معمول یہ تھا کہ جن صاحب سے اختلاف رائے ہوا ہے نہ صرف یہ کہ ان کے ادب واحترام میں کوئی ادنیٰ فرق نہ آنے دیتے بلکہ ان کے کلام کا کوئی صحیح محمل تلاش کر کے لکھ دیتے۔

مثلاً اوزان شرعیہ میں رائج الوقت اوزان کے لحاظ سے "درہم" کی مقدار مقرر کرنے میں آپ نے حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی جیسے بڑے محقق عالم سے اختلاف فرمایا لیکن اس کے لیے صرف اپنے دلائل اور حضرت مولانا کے دلائل کی تردید پر اکتفا

[۱] البلاغ ص: ۱۷۱۔

نہیں کیا بلکہ جستجو کر کے وہ وجہ بھی بیان فرمادی، جس سے حضرت مولانا کا عذر واضح ہوجاتا ہے[1]

طعن وتشنیع ودلآزار اسلوب کا نقصان

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں آغاز شباب میں دوسروں کی تردید کے لیے بڑی شوخ اور چلبلی تحریر لکھنے کا عادی تھا اور تحریری مناظروں میں میرا طرز تحریر طنز و تعریض سے بھرپور ہوتا تھا اور ''ختم نبوت'' میں نے اسی زمانہ میں لکھی تھی لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میرے انداز تحریر کا رخ بدل دیا اور وہ یہ کہ میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب ختم نبوت میں جو دلائل پیش کیے ہیں، بنظر انصاف پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہت مضبوط معلوم ہوتے ہیں اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں مرزا صاحب کی اتباع سے تائب ہوجاؤں لیکن آپ نے اس کتاب میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ مجھے اس اقدام سے روکتا ہے میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ لوگ دلائل پر اکتفا کرتے ہیں، طعن وتشنیع سے کام نہیں لیتے، اس لیے میں اب تک اپنے مذہب پر قائم ہوں اور آپ کے طعن وتشنیع نے دل میں کچھ ضد بھی پیدا کردی ہے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ ان صاحب نے یہ بات کہاں تک درست لکھی تھی لیکن اس واقعہ سے مجھے یہ تنبہ ضرور ہوا کہ طعن وتشنیع کا یہ انداز مفید کم ہے اور مضر زیادہ۔

چنانچہ اس کے بعد میں نے ''ختم نبوت'' پر اس نقطۂ نظر سے نظر ثانی کی اور اس میں ایسے حصے حذف کردیئے جن کا مصرف دلآزاری کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس کے بعد کی تحریروں میں دلآزار اسلوب سے مکمل پرہیز شروع کردیا[2]

---

[1] البلاغ ص:۴۹۶۔ [2] البلاغ ص:۴۶۵۔

کسی رسالہ کی تردید یا کسی فرقہ پر تنقید کا طریقہ

دوسرے نظریات کی تردید میں حضرت والد صاحبؒ کا ایک اصول یہ تھا کہ جس شخص یا گروہ پر تنقید کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات و افکار اور اس کے منشا و مراد کی اچھی طرح تحقیق کر لی جائے، اور اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کی جائے جو اس نے نہیں کہی، یا جو اس کی عبارتوں کے منشا و مراد کے خلاف ہو۔

آج کل بحث و مباحثہ و مناظروں کی گرم بازاری میں احتیاط و تثبت کے اس پہلو کی رعایت بہت کم کی جاتی ہے۔ اور دوسرے کی تردید کے جوش میں اس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح بعض ایسی باتیں مخالف کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جو اس نے نہیں کہی ہوتیں۔

یہ طرز عمل اول تو انصاف کے خلاف ہے دوسرے اس سے تردید کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا، بسا اوقات اس کے نتیجہ میں بحث و مباحثہ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو افتراق و انتشار پر منتج ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت والد صاحب قدس سرہ نے احقر کو اس زریں اصول کی تلقین فرمائی تھی کہ یوں تو انسان کو اپنے ہر قول و فعل میں محتاط ہونا چاہئے لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرو، جسے شرعی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لیے کافی مواد موجود نہ ہو۔

حضرت والد ماجد قدس سرہ کی اس نصیحت نے احقر کو جس قدر فائدہ پہنچایا اور اس کے جن بہتر ثمرات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا، انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

خود حضرت والد صاحب کی تحریروں میں احتیاط کا یہ پہلو جس قدر نمایاں ہے اور اس کے پیش نظر آپ کی عبارت میں جو قیود و شرائط ملتی ہیں ان کی مثالیں دینا چاہوں تو

ایک پورا مقالہ اس کے لیے چاہیے لیکن ایک واضح مثال پر اکتفاء کرتا ہوں۔

خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ مشرقی صاحب نے ایک زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا ان کے عقائد و نظریات جمہور امت سے بہت سے معاملات میں مختلف تھے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایماء پر حضرت والد صاحب نے ان کے نظریات کی تردید میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جو مشرقی اور اسلام کے نام سے شائع ہوا ہے، رسالہ تو مختصر سا ہے لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس کی ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی، اول تو مشرقی صاحب کی تمام تصانیف کا بنظر غائر مطالعہ کیا پھر ان کے جن مقامات پر جمہور امت سے ناقابل برداشت انحراف نظر آیا ان کو قلم بند کیا اور پھر مزید احتیاط یہ کی کہ ان کی عبارتوں کو جمع کر کے مشرقی صاحب کے پاس بھیجا کہ ان عبارتوں سے آپ کی مراد وہی ہے جو ان سے ظاہر ہوتی ہے یا آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں، ان کی طرف سے کوئی واضح جواب نہ آیا تو انھیں دوبارہ خط لکھا اور یہ خط و کتابت کافی عرصہ تک جاری رہی، یہاں تک کہ اس خط و کتابت کے نتیجہ میں یقین ہو گیا کہ مراد وہی ہے جو ان کی عبارتوں سے ظاہر ہے تو پھر اس پر تردید تحریر فرمائی، یہ رسالہ جواہر الفقہ میں شامل ہے[1]

کسی فرد یا جماعت سے متعلق رائے قائم کرنے کے سلسلہ میں پوری تحقیق کے بعد بھی خوف خداوندی کا استحضار

''جماعت اسلامی'' سے متعلق سوال کا جواب تحریر فرمانے کے بعد اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ میری ذاتی رائے ہے جو اپنی حد تک غور و فکر کے بعد فیما بینی و بین اللہ قائم

[1] البلاغ ص: ۴۷۰۔

کی ہے، میں کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی اور بے احتیاطی سے بھی اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، اور دین کے معاملہ میں مداہنت سے بھی، جن حضرات کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو وہ اپنے عمل کے مختار ہیں، مجھے ان سے کوئی مباحثہ کرنا نہیں اور نہ میرے قویٰ اور مصروفیات اس کے متحمل ہیں، اور کوئی صاحب اس کو شائع کرنا چاہیں تو ان سے میری درخواست ہے کہ اس کو پورا شائع کریں، ادھورا یا کوئی ٹکڑا شائع کر کے خیانت کے مرتکب نہ ہوں، واللہ المستعان وعلیہ التکلان ۔(جواہر الفقہ ج۱ص۱۷۲،۱۷۳)

جدید مسائل کو حل کرنے میں دوسرے علماء سے استصواب واستفسار اور ان کی تحقیقات وآراء سے استفادہ

آلۂ مکبّر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کو نماز میں استعمال کرنے کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک تحقیقی فتویٰ اور مستقل رسالہ تحریر فرمایا تھا، اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

احقر نے ان نئی تحقیقات اور دوسری وجوہ فقہیہ کے ساتھ اپنے رسالہ کو دوبارہ ترتیب دیا اور اس کا مسودہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، خیر المدارس ملتان وغیر اہم مدارس اسلامیہ میں حضرات علماء کے غور وفکر اور استصوابِ رائے کے لئے بھیج دیا، ان سب حضرات نے جزوی اختلافات کے ساتھ اصل مسئلہ عدمِ فسادِ نماز میں اتفاق ظاہر فرمایا تو بنام خدا تعالیٰ یہ رسالہ ۱۳۷۲ھ میں شائع کر دیا گیا۔۔۔۔

مزید احتیاط کے لئے احقر نے اپنی تحریر اور مولانا موصوف کی تمام تنقیدات اپنے دارالعلوم کراچی کے ایک ماہر فن محقق مدرس مولانا مفتی رشید احمد صاحب کے سپرد کر دی کہ سب پر غور کر کے مجھے رائے دیں۔(آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام ص۷،۸)

انشورنش (بیمہ زندگی) کے متعلق پوری تحقیق کے ساتھ تفصیلی جواب تحریر فرمایا اور ساتھ میں یہ بھی تحریر فرمایا:

''میرا جواب کوئی آخری فیصلہ نہیں، دوسرے علماء کے سامنے پیش ہوکر اس کی اصلاح بھی ہوسکے گی'' [1]

جدید مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لئے صاحبِ معاملہ اور ماہرین فن سے تحقیق کرنا

مذکورہ مسئلہ کے سلسلہ میں ماہرین فن سے تحقیق کی غرض سے حضرت مفتی صاحبؒ نے مندرجہ ذیل خط تحریر فرمایا:

سوال: بعض مسائل شرعیہ کی تحقیق کے لئے یہ معلوم کرنا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جو آواز دور تک پہونچتی ہے یہ بعینہٖ بولنے والے کی آواز ہوتی ہے، یا اس کا عکس وشبیہ ہوتی ہے، جیسے آواز بازگشت میں ہوتا ہے، یا جیسے گراموفون کی آواز ہے، سوال کا منشاء یہ ہے کہ آواز جو ہوا میں پیدا شدہ لہروں یا تموّج کا نام ہے لاؤڈ اسپیکر کسی منزل میں ان کو بدل کر ان کے مشابہ نئی لہریں پیدا کردیتا ہے، یا انہیں لہروں میں کوئی جدید برقی قوت پید کردیتا ہے، جس کے ذریعہ سے وہ لہریں منتشر ہونے سے پہلے دور تک پہونچ جاتی ہے، براہِ کرم اس مسئلہ میں اپنی تحقیق سے استفادہ کا موقع دیا جائے [2]

جدید مسائل کا محاکمہ قرآن وحدیث کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا آپ جدید مسائل کا قرآن وحدیث اور جمہور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں محاکمہ فرماتے اور اس

---

[1] جواہر الفقہ ص ۱۸۱ ج ۲ [2] آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام ص ۹۷

شرعی محاکمہ سے قبل موصوف جدید مسائل کی ان کے ماہرین سے پوری تحقیق بڑی کدو کاوش کے ساتھ فرماتے، اور جب تک ماہرین کی تحقیقات پر اطمینان نہ ہوجاتا فتویٰ صادر نہ فرماتے بلکہ مزید تحقیقات فرماتے، چنانچہ آپ مشینی ذبیحہ کے متعلق فرماتے ہیں جب تک ان مشینوں کی صحیح صورت حال معلوم نہ ہو کوئی جواب دینا بے کار ہے۔

آگے موصوف رقم طراز ہیں ان حالات میں کسی مفروضہ صورت پر بحث فضول ہے جب تک کہ درآمد کی ہوئی مشین کی صحیح صورت حال معلوم نہ ہو، کوئی فتوی نہیں دیا جاسکتا[1]

تقلید شخصی شرعی حکم نہیں لیکن انتظامی اور واجبی امر ہے

حضرت والد صاحبؒ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلید شخصی کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس دور ہوا و ہوس میں اسی کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے اور جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکمہ کا سوال آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو تو کم از کم ان کے مساوی تو ہو، اور آج اس مساوات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، البتہ ساتھ ہی حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے بلکہ ایک انتظامی فتوی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے وزنی دلائل موجود ہیں، لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے اختیار کرلے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرلے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباع خداوندی کے بجائے اتباع نفس کا دروازہ کھل جائے گا[2]

---

[1] بحوالہ جواہر الفقہ، البلاغ ص:۷۵۷۔ [2] البلاغ ص:۴۱۹۔

باب ۴

فتاویٰ میں امت کی سہولت کا خیال

دوسروں کے لیے تسہیل کا یہ عالم ہے کہ اگر مسئلہ میں جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو آپ امت کی سہولت کی خاطر اصل مسئلہ کا جواب لکھنے کے بعد اس کا کوئی حیلۂ جواز تحریر فرمادیتے تاکہ لوگ تنگی و پریشانی میں مبتلا نہ ہوں اسی نوعیت کے ایک سوال کے جواب میں جو ہبہ مشاع سے متعلق ہے۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

قال فی الدر المختار ولذا یشترط فیه (ای فی عوض الهبة؟ شرائط الهبة کقبض وافراز وعدم شیوع[1]

عبارات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہبہ بالعوض میں بھی شیوع مانع ہے لہٰذا صورت ہبہ مندرجہ سوال جائز نہیں، البتہ ایک حیلہ سے جائز ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ جائداد مشترکہ موہوب لہما کے ہاتھ فروخت کردی جائے اور جب بیع تام ہوجائے تو پھر ان کو اس کی قیمت سے بری کردیا جائے۔ **کذا ذکرہ الشامی فی کتاب الهبة۔**

مواقیت احرام کے سلسلہ میں ہندوپاکستان سے جانے والے بحری جہاز میں حج کے لیے علماء عصر نے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجب دم قرار دیا ہے اس کے برخلاف حضرت مفتی صاحبؒ نے بحری مسافروں کے لیے اس کو ترجیح دی کہ جدہ

[1] شامی ص:۷۸۹، بحر۴/۲۹۲۔

تک احرام کو مؤخر کرنا اور جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے اور نہ اس سے دم لازم آتا ہے جو تسہیل امت کی بین دلیل ہے۔

اسی طرح آپ نے حج بدل کرنے والے کے لیے ملا علی قاریؒ اور حضرت گنگوہی کے خلاف تمتع کرنے کی گنجائش دی ہے۔[۱]

نیز حج بدل کے ایک اور مسئلہ میں جس میں علماء کا اختلاف ہے آپ نے اس میں سے اہون واسہل کو اختیار فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو جواہر الفقہ)۔[۲]

سہولت کی وجہ سے دوسرے مذاہب پر فتویٰ دینے کی ضرورت اور اس کے حدود و شرائط

چونکہ چاروں مذاہب بلاشبہ برحق ہیں اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لیے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ قدس سرہ نے حضرت تھانویؒ کو یہ وصیت کی تھی اور حضرت تھانویؒ نے ہم سے فرمایا کہ آج کل معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کا شکار ہیں اس لیے خاص طور سے بیع وشراء اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذہب میں عام لوگوں کے لیے گنجائش کا پہلو ہو اس کو فتویٰ کے لیے اختیار کر لیا جائے۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لیے چند باتوں کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔

۱: سب سے پہلے تو یہ کہ واقعۃً مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر لیا جائے، اور

---

[۱] البلاغ ص:۶۷۔ [۲] البلاغ ص:۶۸۔

حضرت والد صاحبؒ کے نزدیک اس اطمینان کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک مفتی خود رائی کے ساتھ یہ فیصلہ نہ کرے بلکہ دوسرے اہل فتویٰ حضرات سے مشورہ کرے اگر وہ بھی متفق ہوں تو اتفاق رائے کے ساتھ ایسا فتویٰ دیا جائے۔

۲: دوسری بات یہ ہے کہ جس امام کا قول اختیار کیا جائے اس کی پوری تفصیلات براہ راست اس مذہب کے اہل فتویٰ علماء سے معلوم کی جائیں محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفاء نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اوران کے نظر انداز کردینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

۳: تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا، اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے ''عقد الجید'' میں ائمہ اربعہ سے باہر جانے کے مفاسد تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ مصیبت زدہ خواتین کے لیے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مالکی مذہب پر فتوی دینے کا ارادہ کیا، تو ان تمام باتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ مدنظر رکھا اور براہ راست مالکی علماء سے خط وکتابت کے ذریعہ مذہب کی تفصیلات معلوم کیں، اور تمام علماء ہند سے استصواب کے بعد فتوی شائع فرمایا۔ (یہ رسالہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے نام سے شائع ہوا ہے)۔[2]

---

[1] البلاغ ص:۴۱۹۔ [2] البلاغ ص:۴۱۹-۴۲۰۔

فقہی مسائل میں اجتماعی غور وفکر کی ضرورت

حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ فقہی مسائل میں اجتماعی غور وفکر کا سلسلہ قرون اولیٰ سے چلا آتا ہے جن مسائل میں قرآن وسنت کے اندر کوئی نص صریح نہیں ہے ان میں قرآن وسنت ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زریں ہدایت نامہ دیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم قرآن وسنت میں مذکور نہیں تو اس میں ہمارے لیے کیا ارشاد ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شاوروا الفقهاء العابدين ولا تمضوا فيه رأياً خاصة (رواه الطبراني في الاوسط ورجاله موثقون من اهل الصحيح كذا في مجمع الزوائد للهيثمي ١/١٧٨)۔

اس حدیث کے مقتضیات پر عمل کرتے ہوئے مختلف زمانوں میں علماء امت کا طریقہ رہا ہے کہ وہ نئے پیش آنے والے احکام دینیہ خصوصاً اجتماعی نوعیت کے مسائل میں باہمی غور وفکر مشورہ اور بحث وتمحیص کے بعد کوئی فتویٰ دیتے تھے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کا عمل بھی اسی پر تھا، فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے انہوں نے ماہر فقہاء عابدین کی جو مجلس بنائی ہوئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا، مغلیہ حکومت کے دور میں فتاوی عالم گیری جیسی عظیم الشان کتاب بھی اسی طرح مرتب ہوئی، آخر دور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا طریقہ کار بھی یہ تھا کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں بالخصوص ان مسائل میں جو عالمگیر اور اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں محض اپنی انفرادی رائے پر اعتماد فرمانے کے بجائے وقت کے ماہر فقہاء عابدین سے مشورہ فرماتے

تھے اور موافق و مخالف تمام پہلو سامنے آنے کے بعد کوئی فتویٰ دیتے تھے۔

نئے فقہی مسائل کی تحقیقات کے لیے آپ نے ''حوادث الفتاویٰ'' کے نام سے ایک مستقل سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور ان میں سے بیشتر مسائل میں آپ کا طریقہ کار یہی تھا، عورتوں کے مسائل و مشکلات کو دور کرنے کے لیے ''الحیلۃ الناجزۃ'' بھی اسی طرح تصنیف ہوئی جو حضرت تھانوی کے تفقہ اور دینی بصیرت کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں ''مجلس فقہی مشاورت'' کی شدید ضرورت

یوں تو زندگی ہر دم رواں پیہم دواں ہے اور ہر نیا زمانہ اپنے ساتھ نئے مسائل اور نئے حالات لے کر آتا ہے لیکن خاص طور سے مشین کے ایجادات کے بعد سے حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، اس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور ہر علم و فن میں نئے مسائل پیدا کر کے تحقیق و تفتیش کے نئے میدان کھولے ہیں، اسی ضمن میں ایسے بے شمار فقہی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا صریح حکم قرآن و سنت یا فقہاء امت کے کلام میں موجود نہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے فقہ اور اصول فقہ کی روشنی میں تحقیق و نظر کی ضرورت ہے اسی وجہ سے ''شاوروا الفقهاء العابدين'' کے ارشاد حدیث پر عمل کرنے کی ضرورت شاید پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے ضرورت تو اس بات کی تھی کہ عالم اسلام کے چیدہ چیدہ فقہاء عابدین جن کی فقہی بصیرت، علم و عمل، تدین و تقویٰ اور معاملہ فہمی پر پوری امت اسلامیہ کو اعتماد ہو مشترکہ طور سے ان مسائل پر غور و فکر کریں، لیکن آج پورا عالم اسلام جن سیاسی اور معاشرتی الجھنوں میں گرفتار ہے ان کے پیش نظر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ بحالت موجودہ علماء کے ہاتھ میں اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ وہ ایک ہی ملک کے فقہاء عابدین کو جمع کر کے انجام دے سکیں۔

لیکن ''مَالَا یُدْرَکُ کُلُّهٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّهٗ'' کے پیش نظر صرف کراچی کے

علماء نے اس کام کے لیے ایک غیر رسمی جماعت بنائی ہوئی ہے جس میں کراچی کے ممتاز دینی درس گاہوں کے ماہر اہل فتویٰ شریک ہیں، یہ جماعت نہایت سادگی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہی ہے (مختلف) اداروں کے اہل علم وفتوی وقتاً فوقتاً مل کر بیٹھتے ہیں، نئے مسائل پر غور وفکر اور بحث وتمحیص کرتے ہیں، مسئلہ کے تمام گوشوں کا غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ ہوتا ہے اور ہر شخص خوب کھل کر اپنی رائے پیش کرتا ہے اور جب کوئی مسئلہ طے ہوجاتا ہے تو اس کو دلائل کے ساتھ لکھ لیا جاتا ہے۔ (البلاغ ص:۷۰-۱۷۱۔)

تفرد سے اجتناب اور مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام

تفرد (یعنی دوسرے علماء سے ہٹ کر کوئی ذاتی موقف اختیار کرنے) سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء کرام نے محقق ابن ہمام اور شاہ ولی اللہ صاحب جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ تو ان کے مقابلہ میں بہت اہون ہے، چنانچہ اگر کبھی آپ کا ذہن کسی ایسی رائے کی طرف مائل ہوجاتا جو معروف نقطۂ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں سے کسی کا قول اس کے موافق مل جائے یا معاصر علماء اس رائے پر مطمئن ہوجائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اس وقت تک آپ عموماً اس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔ اس احتیاط کی ایک واضح مثال ''الحیلۃ الناجزۃ'' ہے (جس میں) آپ نے یہ گوارہ نہیں فرمایا کہ محض اپنی رائے سے اس وضاحت کے مطابق فتویٰ دے دیں بلکہ پہلے اس وقت کے اہل فتویٰ حضرات سے استصواب کیا اور اس کے بعد اپنی رائے ظاہر فرمائی۔

آخری سالوں میں تو آپ نے شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ اس غرض کے لیے کراچی کے اہل علم کی ایک باقاعدہ مجلس قائم فرمادی تھی جس کا نام ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' تھا اور اس کا کام ہی یہی تھا کہ وہ نوپیش آمدہ مسائل کی اجتماعی طور پر تحقیق کرے اس مجلس کا اجلاس عموماً ہر مہینہ ایک مرتبہ ہوتا تھا۔ (البلاغ ص:۴۰۹۔)

فصل

مقتدا و پیشوا کے لیے ضروری ہدایات

فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلاً۔ (پ۵ نساء)

جب منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیا اور جب واپس جاتے تو آپ کی نافرمانی کرنے کے لیے مشورے کرتے اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی کہ ان کی پرواہ نہ کیجیے آپ اپنا کام اللہ کے بھروسے پر کرتے رہیں کیونکہ وہ آپ کے لیے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو، اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے لوگ طرح طرح کے الٹے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم واستقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہیے، اگر اس کا رخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ ضرور کامیاب ہوگا۔[1]

منکرات پر نکیر کا طریقہ

اور اہل علم و ارباب افتاء کے لیے اہم ہدایت

حضرت والد صاحبؒ کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عالم یا دینی مقتدا کے حلقہ میں آپ کا جانا ہوتا اور وہاں کے عوام میں آپ کوئی ایسی عام غلطی دیکھتے جو اس عالم یا مقتدا کے علم میں رہی ہے تو اس غلطی پر خود عوام کو نہیں ٹوکتے تھے بلکہ اس عالم یا مقتدا کو تنہائی میں متوجہ

[1] معارف القرآن ۲/۴۸۸۔

فرمادیتے تھے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف سے مسئلہ بتا کر ان کے عمل کی اصلاح کر دیں اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ اگر میں براہ راست لوگوں کو مسئلہ بتا دوں تو لوگ شاید میرے علم وفضل کے تو قائل ہو جائیں لیکن جن عالم یا دینی رہنما سے ان کا دن رات سابقہ ہے اس طرف سے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوگی کہ اتنے دن سے ان صاحب کے ساتھ رہتے ہیں مگر انہوں نے ہمیں کبھی اس غلطی پر متوجہ نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص سے انہیں دینی فائدہ پہنچ رہا تھا اس پر اعتماد میں کمی آجائے گی جو ان کے دین کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ تو اس حد تک احتیاط فرماتے تھے کہ جب کبھی دوسرے شہر میں جانا ہوتا اور کوئی شخص مسئلہ پوچھنے کے لیے آتا تو آپ عام طور پر خود بتانے کے بجائے اس شہر کے مفتی کا پتہ بتاتے کہ ان سے جا کر معلوم کرو، اور اپنے رفقاء سے فرماتے کہ اگر میں اس شخص کو مسئلہ بتا دوں اور مقامی علماء یا مفتی حضرات کے بتائے ہوئے مسئلے سے کچھ فرق ہو جائے تو میں تو کل یہاں سے چلا جاؤں گا اور یہ لوگ مقامی علماء سے بدگمان ہو کر آئندہ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے وقت جھجک محسوس کریں گے[1]

تھوڑا سا وقت خلوت اور ذکر و شغل کے لیے بھی نکالنا چاہئے

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ (پ۳۰ سورۂ انشراح)

یعنی جب آپ ایک محنت یعنی دعوت حق اور تبلیغ احکام سے فارغ ہوں تو دوسری محنت کے لیے تیار ہو جائیں وہ یہ کہ نماز اور ذکر اللہ، دعا و استغفار میں لگ جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم و تبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرنے والے ہیں ان کو اس سے غفلت نہ ہونی چاہئے کہ ان کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لیے بھی مخصوص ہونا چاہئے جیسا کہ علماء سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں، اس کے بغیر تعلیم و تبلیغ بھی مؤثر نہیں ہوتی ان میں نور و برکت نہیں ہوتی[2]

---

[1] البلاغ ص: ۴۹۵-۴۹۶۔ [2] معارف القرآن ۸/۷۷۳۔

اہل علم وارباب افتاء ومقتدا حضرات کو بھی ذکر وعبادت کا خاص اہتمام کرنا چاہئے

اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلاً (سورہ مزمل پ۲۹)

لفظ سبح کے لفظی معنی جاری ہونے اور گھومنے پھرنے کے ہیں اسی سے پانی میں تیرنے کو بھی سبح اور سباحت کہا جاتا ہے کہ پانی میں بغیر کسی رکاوٹ کے گھومنا پھرنا تیراکی کے ساتھ آسان ہے، یہاں مراد سبح سے دن بھر کے مشاغل ہیں جن میں تعلیم وتبلیغ اور اصلاحِ خلق کے لئے یا اپنی معاشی مصالح کے لئے چلنا پھرنا سب داخل ہیں۔

اس آیت میں قیام اللیل کے حکم کی تیسری حکمت ومصلحت کا بیان ہے، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پوری امت کے لئے عام ہے وہ یہ کہ دن میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دوسرے سبھی حضرات کو بہت سے مشاغل چلنے پھرنے کے رہتے ہیں، فراغ بالی سے عبادت میں توجہ مشکل ہوتی ہے، رات کا وقت اس کام کے لئے رہنا چاہئے کہ بقدر ضرورت نینداور آرام بھی ہوجائے اور قیام اللیل کی عبادت بھی۔

فائدہ: حضرات فقہاء نے فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء ومشائخ جو تعلیم وتربیت اور اصلاحِ خلق کی خدمتوں میں لگے رہتے ہیں ان کو بھی چاہئے کہ یہ کام دن ہی تک محدود رہنے چاہئیں، رات کا وقت اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری اور عبادت کے لئے فارغ رکھنا بہتر ہے جیسا کہ علمائے سلف کا تعامل اس پر شاہد ہے، کوئی وقتی ضرورت دینی تعلیمی، تبلیغی کبھی اتفاقاً رات کو بھی اس میں مشغول رکھنے کی داعی ہو تو وہ بقدر ضرورت مستثنیٰ ہے، اس کی شہادت بھی بہت سے حضرات علماء وفقہاء کے عمل سے ثابت ہے۔[1]

[1] معارف القرآن ج۸ ص۵۹۲، ۵۹۳ سورۃ مزمل

اِتَّقُوا مَوَاضِعَ التُّهَم

تہمت و بدنامی کے موقعوں سے بچنا بھی ضروری ہے

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے، ایک رات میں ام المؤمنین حضرت صفیہؓ آپ کی زیارت کے لئے مسجد میں گئیں واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہوئے، گلی میں دو انصاری صحابی سامنے آگئے تو آپ نے آواز دے کر فرمایا ٹھیرو میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دونوں نے بکمال ادب عرض کیا سبحان اللہ یارسول اللہ! (یعنی کیا آپ نے ہمارے بارے میں یہ خیال کیا کہ ہم کوئی بدگمانی کریں گے؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک کیونکہ شیطان انسان کے خون کے ساتھ اس کی رگ و پے میں اثر انداز ہوتا ہے، مجھے یہ خطرہ ہوا کہ کہیں شیطان تمہارے دلوں میں کوئی وسوسہ بدگمانی کا پیدا نہ کرے (اس لئے میں نے بتلا دیا کہ کوئی غیر عورت میرے ساتھ نہیں)

فائدہ: جیسا کہ خود برے کاموں سے بچنا انسان کے لئے ضروری ہے اسی طرح مسلمانوں کو اپنے بارے میں بدگمانی کا موقع دینا بھی درست نہیں، ایسے مواقع سے بچنا چاہئے جس سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہو اور کوئی ایسا موقع آجائے تو بات واضح کر کے تہمت کے مواقع کو ختم کر دینا چاہئے، خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث نے شیطانی وسوسہ کا بڑا خطرناک ہونا ثابت کیا ہے جس سے بچنا آسان نہیں بجز خدا کی پناہ کے۔

تنبیہ: یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان باختیار خود مشغول ہو، اور غیر اختیاری وسوسہ و خیال جو دل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ مضر نہیں، نہ اس پر کوئی گناہ ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۸۵۳ سورہ ناس)

مسلمانوں کو غلط فہمی سے بچانے کا اہتمام بھی ضروری ہے

اسی واقعہ نے ہمیں ایک سبق یہ دیا کہ جو کام فی نفسہٖ جائز و درست ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی یہ خطرہ ہو کہ کسی مسلمان کو خود غلط فہمی پیدا ہوگی، یا دشمنوں کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے گا تو یہ کام نہ کیا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین ابن ابی کا نفاق کھل جانے کے بعد بھی فاروق اعظمؓ کے اس مشورہ کو قبول نہیں فرمایا کہ اس کو قتل کیا جائے، کیونکہ اس میں خطرہ یہ تھا کہ دشمنوں کو عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلانے کا موقع مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔

مگر دوسری روایات سے یہ ثابت ہے کہ غلط فہمی کے خطرہ سے ایسے کاموں کو چھوڑا جاسکتا ہے جو مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہوں گو مستحب اور کار ثواب ہوں، کسی مقصد شرعی کو ایسے خطرہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا بلکہ خطرہ کے ازالہ کی فکر کی جائے گی اور اس کام کو کیا جائے گا۔[1]

لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنا اسی وقت تک محمود ہے جب تک کسی مقصود شرعی پر اثر انداز نہ ہو

اس معاملہ میں اصل ضابطہ جو قرآن وسنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کے نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دینی حکم حلال وحرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہٖ محمود ہو۔

---

[1] معارف القرآن سورہ منافقون ص ۴۵۶ ج ۸

اس کی نظیر حدیث وسنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمی کے خلاف کردی گئی ہیں، اول تو یہ کہ بیت اللہ کا کچھ حصہ تعمیر سے باہر چھوڑ دیا، دوسرے بناء ابراہیمی میں لوگوں کے بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے دو دروازے تھے، ایک مشرقی جانب میں دوسرا مغربی جانب میں جس کی وجہ سے بیت اللہ میں داخل ہونے اور نکلنے میں زحمت نہ ہوتی تھی، اہل جاہلیت نے اس میں دو تصرف کئے کہ مغربی دروازہ تو بالکل بند کردیا اور مشرقی دروازہ جو سطح زمین سے متصل تھا اس کو اتنا اونچا کردیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ نہ ہوسکے، جس سے مقصد یہ تھا کہ وہ جس کو اجازت دیں صرف وہ اندر جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نومسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ نہ وہتا تو میں بیت اللہ کو پھر بناء ابراہیمی کے مطابق بنادیتا، یہ حدیث سب کتب معتبرہ میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا اس کو ترک کردیا، اور منجانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عنداللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہوگیا، مگر یہ معاملہ بیت اللہ کو بناء ابراہیمی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا ایسا نہیں جس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو یا جس سے احکام حلال وحرام متعلق ہوں۔

بخلاف واقعۂ نکاح زینبؓ کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہوجائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو، حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق ہوا تھا، اس تقریر سے بناء بیت اللہ کے ترک اور نکاح زینبؓ پر بارشاد

خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہو گیا۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کی قولی تبلیغ جو سورہ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی ہے اس کو کافی سمجھا، اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم وارادہ کے اس کو چھپایا، اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور اس کا اظہار فرمایا **لکیلا یکون علی المؤمنین حرج فی ازواج ادعیائھم اذا قضوا منھن وطرا** یعنی ہم نے زینبؓ سے آپ کا نکاح اس لئے کیا تاکہ مسلمانوں پر اس معاملے میں کوئی عملی تنگی پیش نہ آئے کہ منہ بولے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح کر سکیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف طعنہ زنی کا ایک ایسے کام میں پیش آیا جو بظاہر ایک دنیوی کام تھا، تبلیغ ورسالت سے اس کا تعلق نہ تھا، پھر جب آیات مذکورہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ نکاح بھی عملی تبلیغ ورسالت کا ایک جزء ہے تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کسی کا خوف طعن وتشنیع مانع عمل نہیں ہوا، اور یہ نکاح عمل میں لایا گیا، اگرچہ بہت سے کفار نے اعتراضات کئے اور آج تک کرتے رہتے ہیں۔[1]

---

[1] معارف القرآن سورہ احزاب ص ۱۵۵ ج ۷

شامی اور بدائع الصنائع کے متعلق

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری کی رائے

فتویٰ لکھنے میں حضرت اکثر شامی ملاحظہ فرمایا کرتے مگر جس قول کے وہ ناقل ہوتے اس کو تو حضرت حجت سمجھتے اور جو صاحب شامی کی ذاتی رائے ہوتی اس کو حجت قرار نہ دیتے بلکہ تنقید وتحقیق کرتے اور فرمایا کرتے کہ معاصر ہیں ھم رجال و نحن رجال۔ ان کی رائے ہم پر حجت نہیں جب تک کہ اسلاف کے قول سے مؤید نہ ہو۔

اوقات فراغ میں حضرت بدائع کو اکثر دیکھا کرتے، بارہا سنا ہے کہ حضرت اس کے مصنف کو بہت دعائیں دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ واقعی یہ شخص فقیہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو فقہ ہی کے واسطے پیدا فرمایا تھا۔

مولوی ظفر احمد صاحبؒ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت فقہ سے مناسبت پیدا ہونے کی کوئی صورت ارشاد فرمائیں فرمایا کہ مفتیوں کی عادت یہ ہے کہ صرف استفتاء آنے کے وقت کتابیں دیکھتے ہیں اس سے کام نہیں چلتا اور جواب میں بہت غلطی ہوجاتی ہے کیونکہ اس وقت جلدی میں ایک جگہ کو دیکھ کر جواب لکھ دیتے ہیں حالانکہ دوسرے مقام میں اس مسئلہ کے اندر تفصیل معلوم ہوتی ہے جس سے اس واقعہ مسئولہ کا حکم بدل جاتا ہے پس فقہ سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے شامی اور بدائع کو بالاستیعاب دیکھنا چاہئے۔

حضرت گنگوہیؒ نے شامی کو کئی بار بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا ہے اس وقت تک بدائع مطبوع نہیں ہوئی تھی اب میں شامی کیساتھ اسکے مطالعہ کو بھی ضروری سمجھتا ہوں۔

حقیقت میں بدائع عجیب کتاب ہے، ایک بار فرمایا کہ جزئیات تو زیادہ شامی میں ہیں مگر اصول اور فقہ کی لم (علتیں) زیادہ بدائع میں کہ اس سے مناسبت ہوجائے تو فقہ میں طبیعت چلنے لگے۔ (تذکرۃ الخلیل ص:۲۹۴)

باب ۵

آداب المستفتی

احکام سے ناواقف عوام الناس پر علماء ومفتیوں سے مسئلہ معلوم کرکے عمل کرنا اوران کی تقلید کرنا واجب ہے

فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (سورہ نحل)

(اگرتم کو علم نہیں ہے تو دوسرے اہل علم سے پوچھو) یہ اہم ضابطہ ہے جو عقلی بھی ہے نقلی بھی کہ جولوگ احکام نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اسی کا نام تقلید ہے، یہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی اس کے سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، امت میں عہد صحابہ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطہ پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرتے کہ جو لوگ عالم نہیں وہ علماء سے فتوی لے کر عمل کریں۔[1]

(مسئلہ) تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت (فَسْئَلُوا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) سے معلوم ہوا کہ جاہل آدمی جس کو احکام شریعت معلوم نہ ہوں اس پر عالم کی تقلید واجب ہے کہ عالم سے دریافت کرکے اس کے مطابق عمل کرے۔[2]

دلائل کی حاجت نہیں

اور یہ ظاہر ہے کہ ناواقف عوام کو علماء اگر قرآن وحدیث کے دلائل بتلا بھی دیں تو وہ ان دلائل کو بھی انہی علماء کے اعتماد پر قبول کریں گے، ان میں خود دلائل کو

[1] معارف القرآن ج۵ ص ۳۳۳ سورہ نحل پ ۱۴ [2] معارف القرآن سورہ انبیاء پ ۱۷ ج ٦ ص ۱۵۹

سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت تو ہے نہیں اور تقلید اسی کا نام ہے کہ نہ جاننے والا کسی جاننے والے کے اعتماد پر کسی حکم کو شریعت کا حکم قرار دے کر عمل کرے، یہ تقلید وہ ہے جس کے جواز بلکہ وجوب میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں [1]

بلاضرورت سوال کرنے کی ممانعت

یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ۔ (مائدہ پ۷)

ان آیات میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض لوگوں کو احکام الٰہیہ میں بلا ضرورت تدقیق اور بال کی کھال نکالنے کا شوق ہوتا ہے اور جو احکام تمہیں دیئے گئے ان کے متعلق بغیر کسی داعیۂ ضرورت کے سوالات کیا کرتے ہیں، اس آیت میں ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایسے سوالات نہ کیا کریں جن کے نتیجہ میں ان پر کوئی مشقت پڑ جائے یا ان کو خفیہ رازوں کے اظہار سے رسوائی ہو [2]

فتویٰ لینے اور مسئلہ پوچھنے سے پہلے مستفتی کی ذمہ داری

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ۔ (مائدہ پ۶)

اس میں مسلمانوں کے لیے ایک اہم اصولی ہدایت یہ ہے کہ اگر چہ جاہل عوام کے لیے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتوے اور تعلیم پر عمل کریں لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کرلیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس مرض کے لیے کون سا ڈاکٹر ماہر ہے، کون سا حکیم اچھا ہے اس کی ڈگریاں کیا کیا ہیں؟ اپنی مقامی تحقیق

[1] معارف القرآن ج۵ ص۳۳۳ سورہ نحل پ۱۴ [2] معارف القرآن، مائدہ ص:۲۴۵ جلد۳۔

کے بعد بھی اگر وہ کسی غلط ڈاکٹر یا حکیم کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کردی تو عقلاء کے نزدیک وہ قابل ملامت نہیں ہوتا لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی کے جال میں جا پھنسا اور پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ عقلاء کے نزدیک خود اپنی خودکشی کا ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لیے دینی امور کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے اہل علم وفن اور تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدیٰ بنایا اور اس کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ عندالناس بھی معذور سمجھا جائے گا اور عند اللہ بھی۔

ایسے ہی معاملہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فان اثمہ علی من افتی یعنی ایسی صورت میں اگر عالم اور مفتی نے غلطی کرلی اور کسی مسلمان نے ان کے غلط فتوے پر عمل کرلیا تو اس کا گناہ اس پر نہیں بلکہ اس عالم اور مفتی پر ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ اس عالم نے جان بوجھ کر ایسی غلطی کی ہو، یا امکانی غور وخوض میں کمی کی ہو، یا یہ کہ وہ عالم ہی نہ تھا اور لوگوں کو فریب دے کر اس منصب پر مسلط ہو گیا۔

لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم یا مقتداء قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں تو اس کا وبال تنہا اس مفتی و عالم پر نہیں ہے بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے جس نے تحقیق کئے بغیر اپنے ایمان کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کے حوالے کردی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد خداوندی ہے: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں، اپنے مقتداؤں کے علم وعمل اور امانت و دیانت کی تحقیق کئے بغیر ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں[1]

---

[1] معارف القرآن، سورۂ مائدہ ۱۴۹/۳۔

اہل علم اور مفتیوں میں اختلاف ہو تو عوام کیا کریں

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتووں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہو تو ہم کدھر جائیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جس طرح کسی بیمار کے سلسلہ میں ڈاکٹروں، طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے بس اس کا علاج کرتے ہیں۔

دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر کوشش کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ افضل سمجھیں اس کی اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور درصورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے، لیکن یہ اسی کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے اگر حقیقۃً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے۔[1]

[1] معارف القرآن، سورۂ انعام ۳/۳۶۶۔

باب ٦

قلم وکتابت کی اہمیت

تعلیم کا سب سے پہلا اور اہم ذریعہ قلم اور کتابت ہے

ایک صحیح حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لما خلق اللہ الخلق کتب فی کتابہ فھو عندہ فوق العرش، ان رحمتی غلبت غضبی ،یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں جب مخلوق کو پیدا کی تو اپنی کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ کلمہ لکھا کہ ''میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی''

اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اول ماخلق اللہ القلم فقال لہٗ اکتب فکتب مایکون الیٰ یوم القیٰمۃ فھو عندہ فی الذکر فوق عرشہٖ،

یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس کو حکم دیا کہ لکھے ،اس نے تمام چیزیں جو قیامت تک ہونے والی تھیں لکھ دیں ،یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش پر ہے (قرطبی)

قلم کی تین قسمیں

علماء نے فرمایا ہے کہ عالَم میں قلم تین ہیں ،ایک سب سے پہلا قلم جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تقدیر کائنات لکھنے کا اس کو حکم دیا، دوسرے فرشتوں کے قلم جس سے وہ تمام ہونے والے واقعات اور ان کی مقادیر کو نیز انسانوں کے اعمال کو لکھتے ہیں ،تیسرے عام انسانوں کے قلم جن سے وہ اپنے کلام لکھتے اور اپنے مقاصد

میں کام لیتے ہیں اور کتابت درحقیقت بیان کی ایک قسم ہے اور بیان انسان کی مخصوص صفت ہے۔ (قرطبی)

امام تفسیر مجاہد نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات میں چار چیزیں اپنے دست قدرت سے خود بنائی اور ان کے سوا باقی مخلوقات کے لئے حکم دیا کُن یعنی ہو جا، وہ موجود ہو گئیں، یہ چار چیزیں یہ ہیں قلم، عرش، جنت عدن، آدم علیہ السلام۔

علم کتابت سب سے پہلے دنیا میں کس کو دیا گیا؟

بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن کتابت ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا گیا تھا اور سب سے پہلے انہوں نے لکھنا شروع کیا (کعب احبار)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ فن حضرت ادریس علیہ السلام کو ملا ہے اور سب سے پہلے کاتب دنیا میں وہی ہیں (ضحاک)

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ ہر شخص جو کتابت کرتا ہے وہ تعلیم منجانب اللہ ہی ہے۔

خط و کتابت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قلم اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا نہ دنیا کے کاروبار درست ہوتے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو وہ نہیں جانتے تھے اور ان کو جہل کی اندھیری سے نور علم کی طرف نکالا اور علم کتابت کی ترغیب دی کیونکہ اس میں بیشمار اور بڑے منافع ہیں جن کا اللہ کے سوا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، تمام علوم و حکم کی تدوین اور اولین و آخرین کی تاریخ ان کے حالات و مقالات اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعہ لکھی گئیں اور رہتی دنیا تک باقی رہیں، اگر قلم نہ ہو تو دنیا و دین کے سارے ہی کام مختل ہو جائیں۔

علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ خط وکتابت کا بہت اہتمام کیا ہے

علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تعلیم خط وکتابت کا بڑا اہتمام کیا ہے جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں، افسوس ہے کہ ہمارے اس دور میں علماء وطلباء نے اس اہم ضرورت کو ایسا نظر انداز کیا ہے کہ سیکڑوں میں دو چار آدمی مشکل سے تحریر کتابت کے جاننے والے نکلتے ہیں فالی اللہ المشتکیٰ [1]

خط نویسی کے چند آداب

اِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قرآن کریم نے انسانی زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا جس پر ہدایت نہ دی ہوں، خط وکتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت وشنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے، اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مکتوب بنام ملکہ سبا (بلقیس) پورا پورا نقل فرمایا گیا، یہ ایک پیغمبر ورسول کا خط ہے، اور قرآن کریم نے اس کو بطور استحسان کے نقل کیا ہے اس لیے اس خط میں جو ہدایات خط وکتابت کے معاملہ میں پائی جاتی ہیں وہ مسلمانوں کے لیے بھی قابل اتباع ہیں۔

کاتب اپنا نام پہلے لکھے پھر مکتوب الیہ کا

سب سے پہلے ایک ہدایت تو اس خط میں یہ ہے کہ خط کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے نام سے شروع کیا، مکتوب الیہ کا نام کس طرح لکھا قرآن کریم کے الفاظ میں مذکور نہیں، مگر اتنی بات اس سے معلوم ہوئی کہ خط لکھنے والے کے لیے سنت انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں، مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اسی ماحول میں خط

---

[1] معارف القرآن پ ۳۰ سورۃ العلق

کے مضمون کو پڑھے اور غور کرے، مخاطب کو تکلیف نہ اٹھانی پڑے کہ کاتب کا نام خط میں تلاش کرے کہ کس کا خط ہے کہاں سے آیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے مکاتیب منقول اور شائع شدہ عالم میں موجود ہیں ان سب میں بھی آپ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے (من محمد عبد الله ورسوله) سے شروع فرمایا گیا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی اپنے چھوٹے کو خط لکھے اس میں تو اپنے نام کی تقدیم پر کوئی اشکال نہیں لیکن کوئی چھوٹا اپنے باپ، استاد، شیخ یا اور کسی بڑے کو خط لکھے اس میں اپنے نام کو مقدم کرنا کیا اس کے ادب کے خلاف نہ ہوگا، اور اس کو ایسا کرنا چاہئے یا نہیں؟

اس معاملہ میں حضرات صحابہ کرام کا عمل مختلف رہا ہے، اکثر حضرات نے تو اتباع سنت نبوی کو ادب پر مقدم رکھ کر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط لکھے ان میں بھی اپنے نام کو مقدم رکھا ہے۔ روح المعانی میں بحر محیط کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما کان احد اعظم حرمة من رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان اصحابه اذا كتبوا اليه كتابا بدأوا بأنفسهم، قلت! وكتاب علاء الحضرمیؓ يشهد له على ماروى۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی انسان قابل تعظیم نہیں مگر صحابہ کرام جب آپ کو بھی خط لکھتے تو اپنا نام ہی شروع میں لکھا کرتے تھے، اور حضرت علاء حضرمی کا خط جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام معروف ہے وہ اس پر شاہد ہے۔

البتہ روح المعانی میں مذکورہ روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کلام افضلیت میں ہے جواز میں نہیں، اگر کوئی شخص اپنا نام شروع کے بجائے اخیر میں لکھ دے تو یہ بھی جائز ہے، فقیہ ابواللیث کی بستان میں ہے کہ اگر کوئی شخص مکتوب الیہ کے نام سے

شروع کردے تو اس کے جواز میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ امت میں یہ طریقہ بھی چلا آرہا ہے اس پر نکیر نہیں کی گئی۔ (روح المعانی وقرطبی)

خط کا جواب دینا بھی سنتِ انبیاء ہے

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اس کے لیے مناسب ہے کہ اس کا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے، اسی لیے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت میں ہے کہ وہ خط کے جواب کو جوابِ سلام کی طرح واجب قرار دیتے تھے۔ (قرطبی)

خطوط میں بسم اللہ لکھنا

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مذکورہ خط سے نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ خط سے نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مکاتیب سے ایک مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ خط کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنا سنت انبیاء ہے، رہا یہ مسئلہ کہ بسم اللہ کو اپنے نام سے پہلے لکھے یا بعد میں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکاتیب اس بات پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم اس کے بعد کاتب کا نام، پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے، اور قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اور بسم اللہ بعد میں مذکور ہے اس کے ظاہر سے جواز اس کا بھی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ اپنے نام کے بعد لکھی جائے لیکن ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اس طرح لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم، من سلیمان بن داؤد الی بلقیس ابنة ذی شرح وقومها. ان لا تعلوا، الخ۔

بلقیس نے جب یہ خط اپنی قوم کو سنایا تو اس نے قوم کی آگاہی کے لیے

سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کردیا، قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بلقیس کا قول ہے، قرآن میں اس کی تصریح نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصل خط میں بسم اللہ مقدم تھی، یا سلیمان علیہ السلام کا نام، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا نام لفافے کے اوپر لکھا ہوا اور اندر بسم اللہ سے شروع ہو بلقیس نے جب اپنی قوم کو خط سنایا تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے ذکر کردیا۔

مسئلہ: خط نویسی کی اصل سنت تو یہی ہے کہ ہر خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے، لیکن قرآن وسنت کے نصوص واشارات سے حضرات فقہاء نے یہ کلیہ قاعدہ لکھا ہے کہ جس جگہ بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جائے اگر اس جگہ اس کاغذ کی بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور ایسی تحریر میں بسم اللہ یا اللہ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہوجائے گا، آج کل جو عموماً ایک دوسرے کو خطوط لکھے جاتے ہیں ان کا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں اس لیے مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لیے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔

ایسی تحریر جس میں کوئی آیت قرآنی لکھی ہو، کیا کسی کافر مشرک کے ہاتھ میں دینا جائز ہے؟

یہ خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو اس وقت بھیجا ہے جب کہ وہ مسلمان نہیں تھیں حالانکہ اس خط میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ ایسا کرنا جائز ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط ملوک عجم کو لکھے ہیں اور وہ مشرک تھے، ان میں بھی بعض آیات قرآنی لکھی ہیں، وجہ دراصل یہ ہے کہ

قرآن کریم کا کسی کافر کے ہاتھ میں دینا تو جائز نہیں لیکن ایسی کوئی کتاب یا کاغذ جس میں کسی مضمون کے ضمن میں کوئی آیت آ گئی ہے وہ عرف میں قرآن نہیں کہلاتا اس لیے اس کا حکم بھی قرآن کا حکم نہیں ہوگا، وہ کسی کافر کے ہاتھ میں بھی دے سکتے ہیں اور بے وضو کے ہاتھ میں بھی۔(عالم گیری کتاب الحظر والاباحۃ)

خط مختصر جامع بلیغ اور مؤثر انداز میں لکھنا چاہیئے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس والا نامہ کو دیکھئے تو چند سطروں میں تمام اہم اور ضروری مضامین بھی جمع کر دیئے اور بلاغت کا اعلیٰ معیار بھی قائم ہے، کافر کے مقابلہ میں اپنی شاہانہ شوکت کا اظہار بھی ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا بیان اور اسلام کی طرف دعوت بھی، اور ترفع وتکبر کی مذمت بھی، درحقیقت یہ خط بھی اعجاز قرآنی کا ایک نمونہ ہے، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ خط نویسی میں تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت بھی وہی ہے کہ تحریر میں طول نہ ہو، مگر ضروری کوئی مضمون چھوٹے بھی نہیں۔(روح المعانی)[1]

تمت

[1] ماخوذ از معارف القرآن پ ۱۹ سورہ نمل ص ۵۶۶ ج ۶

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ

اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ

اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

تصنیف وتالیف کے اصول

اور

مضمون نگاری کا طریقہ

مع

آداب خط وکتابت وصحافت

تصنیف وتالیف، مضمون نگاری، مقالہ نویسی، اخبار بینی، صحافت کے
اصول وآداب اور شرعی احکام

افادات

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْراً یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ.

فقہ حنفی کے اصول وضوابط

مع احکام السنۃ والبدعۃ

اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

آداب افتاء واستفتاء

مع

علمی وفقہی مکاتبت ومکالمت

افادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ، دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

دعائیہ کلمات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

فاضل عزیز مولوی محمد زید مظاہری ندوی مدرس جامعہ عربیہ ہتورا (بارك الله في حياته وفي افادته) نے جو حضرت حکیم الامت کے افادات وارشادات اور تحقیقات ونظریات کو مختلف عنوانوں اور موضوعات کے ماتحت اس طرح جمع کررہے ہیں کہ حضرت کے علوم وافادات کا ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تیار ہوتا جارہا ہے......

ان خصوصیات اور افادیت کی بنا پر عزیز گرامی قدر مولوی محمد زید مظاہری ندوی نہ صرف تھانوی اور دیوبندی حلقہ کی طرف سے بلکہ تمام سلیم الطبع اور صحیح الفکر حق شناسوں اور قدردانوں کی طرف سے بھی شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں۔

اور اسی کے ساتھ اور اس سے کچھ زیادہ ہی داعی الی اللہ اور عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی سرپرست جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی) اس سے زیادہ شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں جن کی سرپرستی اور نگرانی، ہمت افزائی اور قدردانی کے سایہ میں ایسے مفید اور قابل قدر کام اور ان کے زیر اہتمام دانش گاہ اور تربیت گاہ میں انجام پارہے ہیں۔ اطال الله بقائه وعمم نفعه جزاه الله خيرا.

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلی ۱۷/ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ